ڈاکٹر محمد علی ضناوی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور (پاکستان)

اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید

تالیف

ڈاکٹر محمد علی ضناوی

ترجمہ

محمد سعود عالم قاسمی

www.KitaboSunnat.com

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)
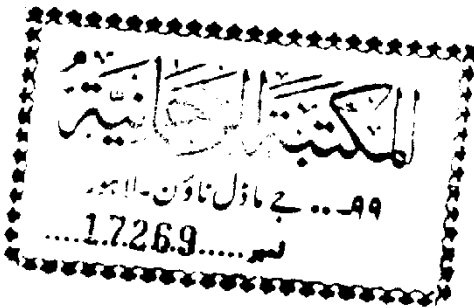
فہرست

حرفے چند

تہذیب عصر حاضر کی انتہائی معروف اور مشہور اصطلاح ہے جس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، اور مختلف معنوں میں اسے استعمال کیا گیا ہے۔ کبھی مذہب کے معنی میں اور کبھی رسم و رواج کے معنی میں، کبھی تمدن کے معنی میں اور کبھی علوم و فنون کے معنی میں۔ دراصل تہذیب ایک ایسی ہی ہمہ جہت اور ہشت پہلو اصطلاح ہے جس کی حسب ضرورت اور حسب نگاہ مختلف تعریفیں کی جاتی ہیں، ان تعریفوں کے پس پردہ مخصوص نقطہ نظر اور مخصوص تصور کو ڈھونڈا جا سکتا ہے دراصل یہ اس بات پر منحصر ہے کہ تعریف کرنے والے کا تصور زندگی کیا ہے۔ وہ کائنات کے بارے میں کیا سوچتا ہے، اور اپنے مقام کا کس طرح تعین کرتا ہے، وہ زندگی اور کائنات کا جو تصور قائم کرے گا اور اپنا جو بھی مقام متعین کرے گا "تہذیب" اس کی علامت اور نقیب قرار پائے گی۔

— بسا اوقات تہذیب کو civilization کے ہم معنی استعمال کیا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ تہذیب کا مفہوم civilization سے پوری طرح ادا نہیں ہوتا، اسی طرح لفظ - cul-ture - بھی تہذیب کے جملہ مفاہیم کا احاطہ نہیں کرتا کیونکہ تہذیب اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کی جگہ یہ دونوں بے تکلف استعمال کئے جاتے ہیں۔

— تہذیب قرآن و حدیث کی اصطلاح نہیں ہے قرآن نے اپنے تصور کی زندگی کے لئے "الدین" کا لفظ استعمال کیا ہے (ان الدین عند اللہ الاسلام) اور دین کا صحیح اور وسیع تصور یہ ہے کہ وہ ایک نظام زندگی ہے جو فرد اور جماعت کو مقصد زندگی کا شعور اور طرز زندگی کا سلیقہ عطا کرتا ہے

اور یہ کہ وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ اگر تہذیب کو اس کے راست تناظر میں دیکھا جائے تو وہ دین کا ہم معنی قرار پاتا ہے فرق اتنا ہے کہ دین کے مفہوم میں ایمان وعقائد تصورات واعمال اور اوراد وظائف غالب ہیں اور تہذیب کے مفہوم میں اخلاق وعادات، طور وطریقہ اور سلوک و برتاؤ نمایاں ہیں تاہم اصل دونوں کی ایک ہے۔

اور اگر دین کا وہ محدود تصور مراد لیا جائے جو بالعموم رائج ہے۔ تو بلاشبہ تہذیب اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر اس تکلف کی قطعا کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مذہب ہے تہذیب نہیں وہ دراصل یہ بھول جاتے ہیں کہ بغیر اساسی تصورات اور مبادی واقدار کے کبھی کوئی تہذیب وجود میں نہیں آتی۔ بلکہ ٹی ایس، ایلیٹ کا خیال ہے کہ

"کوئی تہذیب مذہب کے بغیر رونما نہیں ہوئی اور نہ نشوونما پا سکی، ایک مشاہد کے نقطہ نظر کے لحاظ سے تہذیب مذہب کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہوگی یا مذہب تہذیب کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے"[1]

اور دین اسلام سے زیادہ مستحکم اور روشن اساسی تصورات اور اقدار ومبادی نہ قدیم ہندومت یہودیت اور عیسائیت کے پاس ہیں اور نہ جدید مغربی جمہوریت اور لادینی اشتراکیت کے پاس۔ اس بنیاد پر کہنا بالکل بجا ہے کہ اگر اوریجنل تہذیب کا کوئی علمبردار ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے، اسلام کے علاوہ جو کچھ ہے زیغ وضلال ہے فماذا بعد الحق الا الضلال (پھر حق کے

---

[1] Notes towards the diffination of Culture - P-15

بعد سوائے گمراہی کے اور کیا رہ جاتا ہے ؟)
--- چنانچہ سید قطب شہیدؒ کا یہ دعویٰ کہ "صرف اسلام ہی تہذیب ہے" سو فی صد درست ہے۔

پیش نظر کتاب "اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید" ڈاکٹر محمد علی صناوی کی کتاب "مقدمات فی فہم الحضارة الاسلامیۃ" کا اردو ترجمہ ہے۔ اور وہ اصلاً ایک طویل مقالہ ہے جو IFSO کی چوتھی کانفرنس منعقدہ ریاض میں پڑھا گیا تھا، اس مقالہ میں مصنف نے اسلامی تہذیب پر گرانقدر اصولی بحث کی ہے اور تہذیب اسلامی کی تفہیم جدید کے لئے مقدمات قائم کئے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مقدمات رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مصنف نے اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید پر جو زور دیا ہے اور جس انداز میں ہمیں متوجہ کیا ہے وہ ہم سب کے لئے قابل غور ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ اسلامی تحریکوں نے نظریہ و نظام کی حیثیت سے اسلام کا تعارف کرانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے ضرورت ہے کہ اسی انداز پر تہذیب اسلامی کو متعارف کرایا جائے۔ اور علمی سطح پر بحث و نظر کا نیا رخ تلاش کیا جائے۔

راقم السطور نے بھی اس موضوع پر "اسلامی تہذیب اور اس کا مزاج" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ استاذ گرامی مولانا جلال الدین عمری مدظلہ کی زیر نگرانی لکھا ہے جو منتظر اشاعت ہے۔ اس مقالہ میں اسلامی تہذیب کی داخلیت اور مظاہر پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کا موضوع عمرانی ہے۔ مگر انداز بحث فلسفہ آمیز ہے اصطلاحات کی جدت نے اسے مزید ادق بنا دیا ہے اس لئے ترجمہ میں طرز تعبیر کی خطا کا احتمال بہرحال موجود ہے کوشش یہ رہی ہے کہ مصنف کا مدعا مجروح نہ ہونے پائے اسی لئے بعض مواقع پر اصل الفاظ کی پیروی کو لازم

رکھا گیا ہے برادر محترم عبیداللہ فہد صاحب نے اس سلسلہ میں جو تعاون کیا ہے میں اس کے لئے مشکور ہوں۔

رب زدنی علماً وبک نستعین

محمد مسعود عالم قاسمی
۷/جنوری ۱۹۸۵ء

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی
پان والی کوٹھی علی گڑھ

پیش لفظ

ان صفحات کو لکھتے ہوئے میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے اسلامی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے جس طرح میں اس بات کا مدعی نہیں ہوں کہ میں نے داخلیت اور مظہر کے لحاظ سے اس کے تمام نقوش کی تعیین کرلی ہے۔ کیونکہ یہ نقوش اور پہلو متعدد کتابوں کے متقاضی ہیں۔ اور ان چیزوں کا کتنا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ول ڈورانٹ کی تاریخ تہذیب بھی جو بیس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے ان امور کا کتنا احاطہ کرسکی ہے۔ میرا مقصد اس سے مقابلہ اور تردید نہیں ہے۔ بلکہ ہم نے ایسے خارجی عوامل سے دور رہ کر ایک ہمہ گیر تصور کے ذریعہ اپنی تہذیبی ذات کی معرفت اور تشخص کی خاطر سامنے رکھا ہے تاکہ ہم انہیں دوسروں کے سامنے پیش کرسکیں، ان کا تعارف کراسکیں اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دے سکیں خاص طور سے ان لوگوں کی توجہ مبذول کراسکیں جو ایک ہمہ گیر آفاقی تہذیب کی تخلیق کے لئے جیسا کہ ان کا اعلان ہے (۱) تہذیبوں کے مباحثہ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تاکہ ان کے دل و دماغ مطمئن ہوسکیں اور گوہر مقصود کی اطلاع پاکر اور متاع گم شدہ کی بازیافت کر کے ان کی عقلوں کو آرام و سکون مل سکے۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اپنی منفرد تہذیب کی داستان بیان کرنے

---

(۱) غارودی نے اپنی کتاب حوار الحضارات میں اس کا اعلان کیا ہے۔

کے لئے ہمارے پاس کوئی قاموس (انسائیکلو پیڈیا) نہیں ہے جو حقیقی اسلامی کارناموں کو پیش کرتی اور اسلامی زندگی کے مختلف پہلوؤں، اجتماعی سیاست اقتصادیات، عدل و قضا، علم و فن، حقوق و فرائض، طب و صحت وغیرہ کے تمام گوشوں کی وضاحت کرتی اور ماضی و حال کی مختلف سمتوں کو اجاگر کرتی، تاکہ مستقبل کے معاملات میں اس کے بعض نقوش حدود اور احتمالات کی طرف رہنمائی کر سکتی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے نہ تو اسلامی تہذیب کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیا ہے اور نہ اس کی روح کا، کیونکہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے وقت میرا بالکل یہ ارادہ نہیں یہ تو "الندوۃ العالمیہ للشباب الاسلامی" کے ایک دعوت نامہ کے جواب میں بنیادی طور پر لکھا گیا تھا[1] چنانچہ ایک موقع ہاتھ آیا کہ جدید اور بنیادی مقدمات و اصول کے ذریعہ تہذیب پر ایک نظر ڈال سکوں جو اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید کے لئے مفید اور بار آور کوشش ثابت ہو

---

[1] مارچ ۱۹۷۶ء میں الملتقی الحضاری الاسلامی کے تحت ہونے والی چوتھی کانفرنس کی پہلی نشست میں یہ مقالہ پڑھا گیا تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک دوسرا مقالہ "اسلامی تہذیب کے انحطاط کے اسباب و عوامل" کے عنوان کے تحت جناب محمد الغزالی کے ذریعہ میرے مقالہ کے ساتھ پڑھا جانا تھا لیکن ان کی عدم شرکت سے شرکا بحث و مباحثہ سے مستفید نہ ہو سکے گرچہ شرکاء کانفرنس میری اس رائے سے متفق تھے کہ "اسلامی تہذیب کے انحطاط" کی عبارت غلط ہے اس کی جگہ مسلمانوں کے انحطاط کی عبارت ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اسلامی تہذیب انحطاط کا شکار نہیں ہوتی۔ انحطاط اور زوال جن پر طاری ہوتا ہے وہ اس کے علمبردار (مسلمان) ہوتے ہیں جو صراط مستقیم سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

یہ اصول و مقدمات یا تہذیب کو از سر نو سمجھنے کی کوشش منہجی تعین ہے جس کی موجودگی میں ہمارے لئے ممکن ہے کہ اپنے تہذیبی مفاہیم کو ان کے صحیح چوکھٹے میں فٹ کرسکیں اور پھر تہذیب اسلامی کے ساتھ ان مفاہیم کو وابستہ نہ کریں جو اس سے الگ ہے۔ یا جن کا یہ تہذیب صراحتہً انکار کرتی ہے یا اس تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے وہ قوانین لاگو نہ کریں جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں یا اس کی ممتاز انفرادیت سے ٹکراتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ (حج-٦٧)

ہر امت کے لئے ہم نے ایک طریقہ عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے، پس اے نبی وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں، تم اپنے رب کی طرف دعوت دو یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو۔

مثال کے طور پر اسلامی تہذیب اس بات سے انکار کرتی ہے کہ دوسری تہذیبوں کی طرح اس کے بارے میں بھی یہ کہا جائے کہ وہ ابتدا میں نشو و نما پاتی ہے پھر تیزی سے پھیلنے لگتی ہے پھر سکڑنے سمٹنے لگتی ہے یا ضعف و انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے اور ہم اس کے بعد "اسلامی تہذیب کے انحطاط" کے اسباب و عوامل کی تلاش میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

جب اسلامی تہذیب ٹائن بی کے تہذیبی دوران کے نظریہ کا انکار کرتی ہے، یا ابن خلدون کے نظریہ ضعف کو ٹھکراتی ہے یا مجموعہ مفکرین کے نزدیک تہذیبی انحطاط کی جو اصطلاح رائج ہے ابا کرتی ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ ایک متبادل تفسیر پیش کرے جس کی اس نے تفصیل پیش کر دی ہے۔ چنانچہ اس نے ضوابط کے مفہوم پر خصوصی مرکزیت اور توجہ دی ہے جو تہذیب

کو ایک مسلسل تصویر رحمت (آسمانوں اور زمین کی برکتوں) کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ضوابط جب معطل ہو جاتے ہیں تو تہذیب کا عطائے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تاکہ اس کی جگہ ایک دوسری متبادل تہذیب لے سکے جس کے رشتے زمان و مکان میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور از سر نو مکمل عطیہ contribution کی طرف پیش رفت ہو سکے۔

اس طرح اسلامی تہذیب تہذیبوں کی چوٹی پر کھڑی ہو کر پوری انسانیت کو دیکھ رہی ہے جو اپنے دائمی اور ابدی اصولوں کی وجہ سے بلندی اور صدر نشینی کی مستحق ہے وہ ہرگز پستی اور زوال کی طرف نہیں گر سکتی۔ چنانچہ اصول آج بھی وہی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی اور ترمیم نہیں ہو سکی ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اصول ایک مرحلہ میں تو وجہ ارتقا ہوں اور دوسرے مرحلہ میں انحطاط کا عامل بن جائیں

یہ تہذیب اسلامی کا ایک نیا اور مفید مطالعہ ہے جو مزید بحث و تحقیق اور نظر ثانی کا محتاج ہے ان صفحات میں ہمارے لئے بس اتنا کافی ہے کہ دروازے کے دونوں پٹ کھل جائیں تاکہ ہر باشعور مخلص اس میں داخل ہو سکے اور ہم سب دائمی اسلامی تہذیب کے اوراق کی از سر نو ترتیب میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

وآخر دعوانا عن الحمد للہ رب العالمین

ابو مومن

طرابلس رجب سنہ ۱۴۰۰ھ
سنہ ۱۹۸۰ء

فصل ۱

تہذیب اصطلاح اور مفہوم

فصل نمبر ۱

تہذیب اصطلاح اور مفہوم

تہذیب پیچیدہ اصطلاحوں میں ایک ہے، اس اصطلاح کی سینکڑوں تعریفیں کی جا سکتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر تعریف وجود سے متعلق اس کے خاص نقطہ نظر کا آئینہ ہوگی، اور زندگی کے بارے میں اپنے موجدین کے مفاہیم وتصورات کا خلاصہ ہوگی، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ تہذیب کا مفہوم سطح ادراک کا ایک پیمانہ ہے اور قوموں اور قبائل کی عطیات (contribution) کا عنوان ہے اس کے ذریعہ ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم تاریخ کے واقعات اور تہذیب وایجاد کے بہت سے مضامین کی تفسیر کر سکیں۔ گذشتہ صدیوں میں مورخین، فلاسفہ اور مفکرین نے بہت سی تہذیبی بحثیں کی ہیں، جن میں انہوں نے اپنے تصورات کی وضاحت کی ہے خاص طور سے قوموں کی تاریخ میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہے انہوں نے بہترین اور مثالی تہذیب کی جس کے ذریعہ عوام کو سعادت میسر ہوتی ہے تصویر کشی کی ہے۔

ان تمام تصورات اور آراء کا تجزیہ وتحلیل یہاں ممکن نہیں ہے یہ ہمارے موضوع سے خارج بھی ہے البتہ ہم ناگزیر سمجھتے ہیں کہ بعض معالم ومفاہیم کی اتنی وضاحت ضرور کر دیں جو ہمارے بحث سے متعلق ہو اور جس سے تہذیب کے اسلامی مفہوم کی تعیین میں مدد مل سکے۔

تہذیب ہی مدنیت ہے

تہذیب کا اولین مفہوم وہ ہے جو اسے تمدن کی اصطلاح کے مرادف قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق تہذیب تمدن کا اور تمدن تہذیب کا نام ہے۔ تمام قومیں بالخصوص وہ بدو اور صحرائی قبائل جو شہری زندگی کے مظاہر سے دور ہیں انہیں مہذب نہیں کہا جا سکتا اگرچہ ان کے پاس فکر وسلوک کے معیارات موجود ہوں۔ مگر یہ رائے

جس نے محققین کے افکار و تصورات میں خاصی اہمیت حاصل کرلی تھی اس کا باطل اور متناقض ہونا ظاہر ہوچکا ہے ہر معاشرہ کی ایک تہذیب ہوتی ہے چاہے وہ تمدن کے بالکل ابتدائی دور میں ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زندگی کے ایک متعین دھارے میں انسانوں کا اجتماع اور باہمی تعاون بذات خود تہذیب ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تہذیب دوسری معیاری تہذیبوں سے بہت پیچھے ہوتی ہے۔

تہذیب عقل یا تاریخ یا اقتصاد کا نام ہے

عقل پرستوں کا ایک دوسرا گروہ ہے یعنی ان مغربی فلاسفہ کا جنہوں نے یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں عقل کے ناخن لیے، انہوں نے تہذیب کی تفسیر و تعین میں کھلی ہوئی ناانصافی کی انہوں نے تہذیب کو عقل کے مرادف یا بہتر حالات میں ثمرات عقل کے مرادف قرار دیا۔ ان کے نزدیک تہذیب بس وہ انسانی مظاہر ہیں جو عقل اور اس کے فیصلوں کے معیار پر قائم ہیں۔ ان کی رائے کے مطابق عقل ہی انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر حکمراں رہی ہے اس لئے عقل ہی تہذیب کی تفسیر کرتی، اور اسے اس کا صحیح حدود اربعہ عطا کرتی ہے۔ تہذیب کے اس عقلی مفہوم سے دوسرے بہت سے تصورات نکلے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ تہذیب تاریخ کا نام ہے ان کے نزدیک تاریخ ہی تہذیب ہے تاریخ ہی قوموں اور ملکوں کے معرکے مذاہب اور ثقافتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ تہذیب وہ سائنس ہے جس کی بنیاد ان ایجادات پر ہے جو انسان ~~کو بہتر~~ زندگی گذارنے اور ارد گرد کے ماحول سے فائدہ اٹھانے کا اہل

بناتی ہے۔ تہذیب کے اس مفہوم میں قابل لحاظ چیز صرف ٹکنالوجی ہے۔ یہی از اول تا آخر تہذیب ہے۔

سائنس اور ایجادات میں وہ دونوں چیزیں ہیں جنہوں نے تہذیب کو زندگی اور ترقی بخشی ہے اور نتیجہ کے طور پر اس کا صحیح حدود اربعہ اسے عطا کیا ہے۔

اور بعض لوگوں نے یہ کہدیا کہ زندگی ان بنیادی معاشی عناصر پر مرتکز ہے جو اپنے انجام میں تہذیب کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لئے تہذیب دراصل اقتصاد ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اقتصادی مسائل کا مجموعہ تاریخ اور قوموں و قبائل کی باہمی کشمکش اور صلح و بقا کی تفسیر کرتا ہے اس لئے اقتصادی حقیقت اور تہذیب سے اس کے منفی و مثبت تعلق کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

تہذیب طریقۂ فکر و عمل ہے

تہذیب کی ان تعریفوں کی محدودیت اور بعض پہلوؤں میں نقص کے مقابلہ میں بعض مفکرین نے تہذیب کی اصطلاح میں عمومیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے نسبتاً جامع و ہمہ گیر تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم باولز[1] کے نزدیک تہذیب ہر وہ شے ہے جو انسان کو اس کی انسانیت کی تحصیل میں مدد کرے۔ اگر تہذیب نہ ہوتی تو وہ نوع حیوان کا ایک جزو ہوتا جب کہ ٹیلر[2] نے زیادہ باریک بینی اور مہارت کا ثبوت دیا ہے

---

[1] باولز: ماوراء التاریخ ص ۱۴۸

[2] مجلہ عالم المعرفہ جلد ۵ ۱۹۸۰ء ثقافت کی بحث میں

وہ کہتا ہے "ہر وہ چیز جسے انسان طریقہ فکر و عمل کی حیثیت سے اختیار کرے، جس کی خود تعلیم حاصل کرے اور دوسرے انسانوں کو اس کی تعلیم دے، تہذیب ہے"۔ اس میں کائنات کی فلسفیانہ تفسیر سے متعلق وہ نظریات بھی شامل ہیں جو زندگی کے فہم میں اور معیشت کو کسی بھی شکل کے ذریعہ آسان بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ اس طرح نظم و ضبط کے وہ اسالیب بھی اس میں شامل ہیں، جس کا مقصد اجتماعی نظام کا استحکام اور سلوک کے متعین نمونوں کی اشاعت ہے"۔

تاریخ تہذیب کے انسائیکلو پیڈیا کے مصنف ول ڈورانٹ کی تعریف کے مطابق تہذیب "وہ اجتماعی نظام ہے جو انسان کی تہذیبی تخلیق میں اضافہ کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے، اس کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں اضطراب اور پریشانی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انسان جب خوف سے مامون ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں ترقی و پیش رفت کی محرکات اور تخلیق و ایجاد کے عوامل نشو و نما پاتے ہیں۔ اور اس کے بعد طبعی عوامل اسے زندگی کے فہم اور اس کے ارتقا کی طرف گامزن ہونے پر لازماً مجبور کرتے ہیں"۔

تہذیب کا دوسرا نام طاقت ہے

اس کے بعد طاقت کے مسائل سے بحث کرنے والے سامنے آتے ہیں وہ از سر نو تہذیب کو طاقت اور اس کے ذریعہ حکمرانی کے اسالیب میں محصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے یہ سمجھا کہ طاقت ہی تخلیق و ابداع کا سرچشمہ ہے اور پہلے انسان نے اپنے جسم میں

ڈاکٹر احمد العصیر ایضاً

چھپی ہوئی عضویاتی طاقت کا استعمال کیا چنانچہ عضویاتی وجود طاقت کا اولین سرچشمہ قرار پایا۔ پھر اس میں ارتقا ہوا

ٹائن بی اور کاہن کے نزدیک تہذیب کا مفہوم

ارنلڈ ٹائن بی اپنی تہذیبی بحثوں میں کیتھولک کلیسا سے تہذیب کا تعلق جوڑنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں تہذیب مذاہب سے جنم لیتی ہے اور ان میں سب افضل تہذیب وہ ہے جو پوپ کی سربراہی میں کیتھولک مسیحی مذہب سے وجود پاتی ہے۔ اور یہی دراصل مغربی تہذیب ہے اور یہی تنہا ناموس الہٰی کی چنگاری کی حفاظت کرتی ہے۔ اور صرف یہی تہذیب اس بات پر قادر ہے کہ وہ خود کو سابقہ تہذیبوں کے انجام سے بچا سکے۔

ٹائن بی نے یہ بحث اس وقت کی جب کہ اس سے پہلے اس نے تہذیب کے نقوش ان الفاظ میں متعین کر دیے "وہ اجتماعی اور ثقافتی میدان میں انسان کے حاصل عمل کا نام ہے، اور یہ آگے بڑھنے والی حرکت ہے جامد و ساکت دستاویز نہیں ہے۔ یہ مسلسل حیاتیاتی سفر ہے جو کسی منزل پر ختم نہیں ہوتا۔"[1] ٹائن بی کے اس مفہوم میں پروفیسر ہانز کاہن بھی برابر کا شریک ہے وہ زور دیکر کہتا ہے کہ مغربی تہذیب ازلی و سرمدی ہے اور انحطاط و تردد کو قبول نہیں کرتی، اس لئے کہ ناموس الہٰی اس کا ماخذ اور سرچشمہ ہے اور جب کہ مغربی تہذیب ایک آئیڈیل تہذیب ہے تو چاہیے کہ جبراً سے حلقۂ تقدس میں گھیر دیا جائے۔[2]

---

[1] حوالہ سابق [2] معالم فی الطریق، "الاسلام ھو الحضارۃ"

ابن خلدون اور تہذیب

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں تہذیبی علوم سے تعرض کرنے والوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کا مقدمہ تہذیب پر قابل قدر اور قیمتی مباحث پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابن خلدون کی تعریف تہذیب آبادی مدنیت اور مملکت کی آبادکاری تک محدود ہے۔ اس لئے یہ تعریف بھی تنگ اور محدود ہے جس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ تہذیب کی اصطلاح اور اس کے متعدد مظاہر کا احاطہ کر سکے۔

اسلام ہی تہذیب ہے

دور جدید کے مسلم مفکرین میں جنہوں نے تہذیب سے بحث کی ہے سر فہرست سید قطب شہید ؒ ہیں انہوں نے تہذیب کی جو تعریف کی وہ "شعار" سے زیادہ قریب ہے انہوں نے اپنی کتاب معالم فی الطریق میں "اسلام ہی تہذیب ہے" کے عنوان سے ایسی بحث کی ہے جس میں کسی مجادلہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلام تہذیب ہے اس کے سوا جو کچھ ہے رجعت ہے، اس لئے اسلام کے علاوہ جو نظریات اور مذاہب قوموں کے پاس ہیں، ان پر تہذیب کا اطلاق درست نہیں۔ ان کے بھائی محمد قطب بھی ان سے متفق ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ "تہذیب کی اصطلاح کا اطلاق یونان، ایران، روم اور مغرب پر جائز نہیں ہے کیونکہ ان سب نے بدترین جاہلیت کی زندگی بسر کی ہے اور اب تک اس میں اسیر ہیں[۲]

---

[۲] الندوۃ العالمیہ للشباب الاسلامی کی تیسری کانفرس میں محمد قطب کے خیالات

تہذیب اور وحی الہٰی

مالک بن نبی نے کوشش کی ہے کہ تہذیب کو آسمان سے نازل ہونے والی وحی سے مربوط کر دیں ان کے الفاظ میں "تہذیب کسی بھی قوم میں صرف اس وحی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے شریعت اور لائحہ عمل کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ گویا انسان کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے کہ اس پر تہذیب کا آفتاب اس وقت طلوع ہوگا جب اس کی نظر ارضی زندگی سے ماوراتک دیکھے گی[1]"

اسلامی تہذیب یا دین اسلام

استاذ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تہذیب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ ایک مکمل نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات اعمال و اخلاق اس کی انفرادی، خانگی، اجتماعی اقتصادی، سیاسی زندگی پر محیط ہے، اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین اللہ نے مقرر کئے ہیں ان کے مجموعہ کا نام دین اسلام یا اسلامی تہذیب ہے[2]"

زندگی سے متعلق مفاہیم کا مجموعہ

تقی الدین نبہانی نے تہذیب اور مدنیت میں فرق کیا ہے وہ تہذیب کا تعارف "زندگی سے متعلق مفاہیم کا مجموعہ" سے کراتے ہیں۔ جب کہ مدنیت کو زندگی کے معاملات میں

---

[1] شروط النہضہ سے ماخوذ

[2] اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

استعمال کی جانے والی محسوسات اشیا کی مادی شکلوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اسلامی تہذیب "وہ تہذیب ہے جو ایمان باللہ کی بنیاد پر قائم ہے"[۲۳]

کیا تہذیب کے مفہوم کی مجرد تعیین ممکن ہے؟

تہذیب کے ان تصورات و مفاہیم کے درمیان ان تعریفوں کے پس پردہ پنہاں بنیادی خیالات واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر مصنف اس بات میں کوشاں نظر آتا ہے کہ کائنات، حیات اور انسان کے سلسلہ میں اپنے تصورات اور تہذیبی حقیقت کے درمیان مضبوط رشتہ قائم کرلے تاکہ بطور نتیجہ اس کی فکر اور اس کے انطباق پر تہذیب کا اطلاق ہوسکے اور ان دونوں پر مطلوبہ مہر کی چھاپ لگ جائے۔

ایک اصطلاح کی حیثیت سے تہذیب کی تعیین فکری حدود اربعہ سے دور رہ کر کرنی چاہیئے۔ اگر ہم تہذیب کو ایک اصطلاح کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ہم پر واجب ہے کہ ہم تہذیب کی اصلی تصویر سامنے لائیں اور کسی بھی قوم و ملک کے دینی ثقافتی اور فکری کارناموں کی صحت و خطا سے قطع نظر کریں۔ کیونکہ اس معیار پر تہذیب کے مفہوم کی تعیین سے آخری نتیجہ کے طور پر بہت سی چیزوں کی تفہیم آسان ہو جائے گی۔

تہذیب اور مبادی میں فرق

سب سے پہلے جس چیز پر زور دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تہذیب تعامل (Practice)

---

[۲۳] نظام الاسلام ص۵۹

کا نام ہے یعنی یہ اس کائنات میں انسان کی سرگرمیوں کا انعکاس ہے، اور تہذیب (زیادہ لطیف معنی میں) انسان کے ان اعمال کی ایک تصویر ہے جن کی بنیاد اس کے اصول، مبادی و مقاصد اور اقدار و تصورات ہیں۔ یعنی تہذیب بجائے خود مقاصد و مبادی کا نام نہیں ہے۔ اصول، مبادی، اقدار یا تصورات اپنا مستقل مفہوم رکھتے ہیں۔ اور یہی چیزیں انسان کے مختلف اعمال اور ہر مرحلہ میں اس کی سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

تو ایک حالت یا چند متعین حالات میں ان مفاہیم کو تصورات کے نفاذ کا نتیجہ ہے۔ اور تہذیب ایک متعین زمانہ میں یا مسلسل زمانوں میں کائنات کا تفاعل بھی ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کے اصول، زندگی سے متعلق تصورات و اقدار کا مجموعہ ہیں۔ جو عقیدہ، امر و نہی، اور زندگی اور شعبوں کی تنظیم پر مشتمل ہیں۔

لیکن یہ مفاہیم و تصورات اگر روبہ عمل نہ ہوں تو ان کی حیثیت محض ماضی کے ورثہ اور قیمتی کتابوں کی رہ جاتی ہے، اور سطروں اور حروف کو تہذیب کا نام دینا درست نہیں۔ بلکہ انہیں اصول یا افکار کا نام دینا مناسب ہے تاآنکہ وہ امر واقع اور تنظیم کا روپ دھار لیں اور فعل و عمل کا لباس پہن لیں، یعنی دنیا میں ان کا وجود محسوس ہو اور ایک متعین جگہ میں ان کا تفاعل جلوہ گر ہو جائے اس وقت تفاعل اور تطبیق کی صفات سے متصف ہو کر تہذیب رونما ہوگی، اس وقت تہذیب پر اسلامیت کا اطلاق اور اسے اسلامی تہذیب کہنا صحیح ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفاذ کے بغیر تنہا اقدار بس فکری خوش حالی کا نام ہے جہاں کسی تہذیب کا وجود نہیں، کیونکہ تہذیب تفاعل کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔

یہیں سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں اسلام یہ کہتا ہے کہ ایمان، قلبی یقین اور اس عمل کا نام ہے جو ایک ساتھ زندگی میں سرایت کر جائے۔

لیکن تہذیب اور مبادی کے درمیان اس تفریق سے تہذیبوں کی تعین وتقویم میں معیارات کا استعمال ساقط نہیں ہو جائے گا۔ چنانچہ جس قدر مفاہیم وتصورات درست، صحتمند اور انسان کے عمل وتجربہ میں معین ومددگار ہوں گے اسی قدر صورت کی تشکیل ہوگی یعنی تفاعل اسی قدر بہتر ہوگا اور تہذیب روشن ومنور ہوگی۔ اور تصورات جس قدر فطرت سے دور ہوں گے اسی قدر صورت دھندلی ہوگی یہاں تک کہ بسا اوقات بدصورت اور کریہہ النظر ہو جائیگی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر انسانی جماعت ایک تہذیب کی حامل ہوتی ہے چاہے اس جماعت کا ثقافتی اور عمرانی معیار کتنا ہی پست ہو اور اس کے افکار وعقائد خواہ کچھ ہوں۔ ان تمام تہذیبوں میں واحد فرق خود افکار واقدار اور معیارات کا ہے۔

اس وجہ سے ہم بدویت اور وحشت میں ڈوبے ہوئے طبقوں اور جماعتوں کو اہل تہذیب کہہ سکتے ہیں[1]۔ اس طرح یونان، فرانسیسی، رومی، بابلی، فرعونی، مغربی سرمایہ دارانہ اور مشرقی کمیونسٹ ملکوں کو بھی مہذب کہہ سکتے ہیں۔ گرچہ یہ قومیں ماضی میں یا اب بھی ایسے نظریات اور اصولوں پر ایمان رکھتی ہیں جن کے سلسلہ میں اسلام سے قطع نظر خود جدید سائنس یہ کہتی ہے وہ انسانی فطرت سے دور ہیں اور تباہی وبربادی اور ظلم ونا انصافی کی طرف مائل ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اعتقاد اور نظریہ کا بطلان ان اصولوں کو تفاعل کا روپ اختیار کرنے سے نہیں روکتا یعنی تہذیب کو جلوہ گر ہونے سے نہیں روکتا بلکہ وہ نظریہ حرکت وعمل کے

---

[1] ول ڈورانٹ اپنی کتاب تاریخ تہذیب میں کہتا ہے کہ "وحشی بھی مدنیت کے ایک اہم مفہوم کے اعتبار سے متمدن ہے کیونکہ وہ قبیلہ کا ورثہ اپنے فرزندوں تک منتقل کرنے کی فکر کرتا ہے اور قبیلہ کا ورثہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند قوانین ہیں اور اقتصادی، سیاسی، عقلی اور اخلاقی عادات ہیں۔

واقعات کی پردہ کشائی کرتا ہے اور تہذیب کے برپا ہونے میں مدد دیتا ہے۔

اصطلاحات کا اسلامی تصور

تہذیب اور مبادی کے صحت اور بطلان کے درمیان یہ تفریق عام اصطلاحوں کے اسلامی تصور سے ہم آہنگ ہے اس لئے کہ اسلام، جو عربوں کی زندگی اور شریعت الٰہی سے منحرف دوسری قوموں کی زندگی کو جاہلیت سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ان کے بہت سے عادات وافکار اور اصول ونظریات کا بطلان واضح کرتا ہے، ان زندگیوں کے لئے ایسی اصطلاحیں استعمال کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا جو تقدس اور صحت مند دینی فہم سے قریب تر ہوتی ہیں۔ عبادت جو اہم ترین اور پاکیزہ ترین جوہر حیات ہے اس اصطلاح کے ذریعہ اللہ نے ان قوموں کا عمل بیان کیا ہے وہ کہتا ہے

أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ ٱلْأَقْدَمُونَ (شعراء-۷۶)

کبھی تم نے ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہیں۔

یہی نہیں بلکہ اللہ نے حرم شریف کے اردگرد مشرکین مکہ کی ان سرگرمیوں کو جو کھیل تماشہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں، نماز کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ ٱلْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَتَصْدِيَةً (انفال-۳۵)

بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے۔ بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں۔

اگرچہ شکلیں کبھی نفرت وکراہیت کا موجب ہو جاتی ہیں اور کبھی رحمت وشوق کا، یہاں تک

لفظ "الصبغۃ" جو زندگی سے متعلق تصورات و مفاہیم اور اصول مبادی کے مجموعہ کا نام ہے قرآن میں یہ اس طرح استعمال ہوا ہے کہ خدا کے صاف شفاف رنگ کی دوسرے رنگوں پر افضلیت ثابت کی جائے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ۔ ۱۳۸)

اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔

اس وجہ سے اگر ہم "اسلام سے پہلے کی عربی تہذیب" کے الفاظ استعمال کریں تو درست اور جائز ہے اور اس صورت میں ہم ایک متعین زمانہ میں عربی شکل پر اس اصطلاح کا اطلاق کر رہے ہوں گے اور اس شکل کے سلسلہ میں موقف کی تعین سے ہمیں بحث نہ ہوگی لیکن جب ہم اسلام سے پہلے کی جاہلی عربی تہذیب" کے الفاظ استعمال کریں گے تو ہم نے موقف کی تعین کر لی ہوگی اور اپنے فکری رجحانات کی وضاحت کر دی ہوگی۔ اس بنیاد پر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم قدیم کی یونانی، رومی، فرعونی صورتوں اور حال کی اشتراکی اور مسیحی مغربی صورتوں کے لئے بغیر کسی خوف اور تردد کے تہذیب کی اصطلاح استعمال کر سکیں اس لئے کہ اسلام کی نگاہ میں یہ مفہوم بالکل صحیح ہوگا۔[۱]

---

[۱] البتہ تعلیمی نقطہ نظر سے اور تمیز کی خاطر (جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے) یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی نئی نسلوں کی اس طرح پرورش کریں کہ اصطلاح پر ہمارا قابو ہو اور ساتھ ہی دوسروں کے سلسلہ میں ہمارا موقف بھی متعین ہو یعنی ہم دوسری تہذیبوں کے وجود کو تسلیم کریں۔ ایک اسلامی تہذیب ہے جس سے ہمارا تعلق ہے اور دوسری تہذیبیں ہیں جو جاہلیت پر مبنی ہیں یعنی وہ اسلام سے تعلق نہیں رکھتیں

تہذیب کی تعریف

فکری اور اصولی پس منظر سے قطع نظر ایک اصطلاح کی حیثیت سے ہم تہذیب کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں "تہذیب ایک اصطلاح ہے جو ایک متعین جگہ میں اور ایک متعین زمانہ میں یا مسلسل زمانوں میں کسی بھی جماعت کی انسانی سرگرمیوں کے تفاعل کا نام ہے جو زندگی سے متعلق خاص تصورات اور مفاہیم رکھتی ہے۔ یہ تعریف مندرجہ ذیل عناصر کی وضاحت کرتی ہے جن سے تہذیب کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔

(۱) انسان اپنی کلیات کے ساتھ کسی بھی تہذیب کا محور ہے اور وہ ان تمام جسمانی، روحانی، عقلی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کا مالک ہونے کی وجہ سے جن کی رہنمائی زندگی سے متعلق تصورات و مفاہیم کرتے ہیں۔ تفاعل کا کام انجام دینے والا ہے۔

(۲) تہذیب انسانی جماعت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ تنہا فرد کوئی تہذیب ایجاد نہیں کرتا یعنی اجتماعیت تہذیبی وجود اور یافت کے لئے ضروری ہے۔

(۳) وہ مکان اور ماحول جس میں تفاعل کا جاری ہوتا ہے۔

(۴) سرگرمیوں کے تفاعل اور تہذیبی وجود کی حیثیت کے سلسلہ میں زمانہ ایک اساسی عنصر ہے۔

اصطلاح تہذیب کی یہ تعریف بہت سی سلبی چیزوں کی نفی کرتی اور بہت سی ایجابی چیزوں پر زور دیتی ہے ان میں چند حسب ذیل ہیں۔

یہ تعریف کسی قوم پر دوسری قوم کی برتری کے نظریہ کو قبول نہیں کرتی وہ نظریہ جو کہتا ہے کہ قومیت تہذیب کی محرک ہے اور بعض انسانی قومیں اس وجہ سے ترقی کرتی اور آگے بڑھتی ہیں کہ ان کے اندر ترقی کی موزونیت اور صلاحیت ہوتی ہے، جب کہ دوسری قومیں ترقی کے لئے کافی صلاحیتوں سے متمتع نہیں ہوتیں اور ابتدائی حالات یا دور طفولیت ہی میں رہ جاتی ہیں۔ یہ نظریہ

قومیت عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی بہت سی قوموں میں رائج تھا اور مغربی یورپ و امریکہ میں آج تک مروج ہے[1]۔

یہ تعریف سفید فام کی برتری اور سیاہ فام کی پستی اور انسانی سرگرمیوں میں اس کی عدم صلاحیت ارتقا پر یقین نہیں رکھتی رنگ کی برتری کے ضمن میں یورپین قوموں نے سیاہ فاموں کو غلام بناتے اور انہیں ذلیل کرنے اور امریکہ کے اصلی باشندے سرخ ہندیوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کو روا قرار دے دیا ہے۔ اس طرح یورپین آریہ نسل کی برتری کے نظریہ نے ان کے لئے اس بات کو جائز کر دیا کہ دوسری قوموں میں اپنی کالونی بنائیں اور ان کی پیداوار کا استحصال کریں۔

یہ تعریف تہذیب کی تشکیل اور مسابقت میں سارے انسانوں کو برابر قرار دیتی ہے کیونکہ اعلیٰ ترین ارتقا کے لئے انسانی اجتماعیت کا زیادہ سے زیادہ تفاعل ممکن ہوگا۔

تہذیب کی تشکیل میں اس تعریف کی رو سے ماحول کو قطعی فیصلہ کن دخل نہیں ہے البتہ یہ تعریف ماحول کے پیداوار اور وسائل سے استفادہ و تفاعل کو تہذیب اور اس کی ترقی کے لئے اہم سرچشمہ قرار دیتی ہے۔

یہ تعریف اقتدار کو بنیادی محرک اور انسانی سرگرمیوں کا ہدف تسلیم کرتی ہے۔

اسلامی تہذیب کی تعریف

بحیثیت ایک اصطلاح کے تہذیب کی تعریف کی روشنی میں امر کائنات انسان اور حیات سے متعلق اسلامی تصورات و مفاہیم کی روشنی میں (جن پر بعد میں ہم گفتگو کریں)

---

[1] حسین مونس الحضارۃ ص ۲۷

ہمارے لئے "اسلامی تہذیب" کی تعریف وتعین ممکن ہے، وہ یہ کہ اسلامی تہذیب حیات و کائنات سے متعلق اسلامی مفاہیم کے تحت ایک انسانی جماعت کی سرگرمیوں کے تفاعل کا نام ہے جو روئے زمین میں اللہ کی خلافت کو وجود میں لاتی ہے۔"

یہ تعریف تہذیب کی عام اصطلاح کو اور "تہذیبی رنگ" کے لئے تشکیل شدہ اسلامی مفاہیم کو احاطہ کرنے والی مختلف اشیا، انسان، حیوانات، نباتات، جمادات اور کئی جہاں کے ساتھ روئے زمین میں خلافت الٰہی کے قیام کے لئے تفاعل کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

پھر یہ تعریف اتنی وسیع ہے کہ اس میں تہذیب اسلامی کی متعدد کڑیاں شامل ہو سکتی ہیں۔ ابتدا تاریخ سے انبیاء ورسل اور ان پر ایمان لانے والوں کے وسیع ترین حلقے بھی اس میں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کڑی جس کی ابتدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہوئی اور اس کے بعد جو واقعات اور مظاہر تفاعل رونما ہوئے وہ سب اس میں شامل ہیں۔

اسی طرح عالمی اسلامی تہذیب[1] اس پوزیشن میں ہو گئی کہ تمام انبیائی قوموں اور قبیلوں کے تفاعل اور تعامل کو اپنے جلو میں سمیٹ سکے، اور سیاہ، سفید، عرب و عجم، یورپ و امریکہ کے تمام باشندوں کو اندر داخل کر سکے، اور انسانی خدمت و سعادت کے لئے کام کر سکے تاکہ اس کا احاطہ کرنے والی تمام کائنات کے ساتھ موجودات کے خالق کی بنیادی تسبیح میں ان کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

---

[1] اس مفہوم کی روشنی میں تاریخ کو از سر نو مرتب کرنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے، ایمان کی تاریخ ایک ہے جس کی پہلی کڑی کا آغاز پہلے انسان کے ظہور سے ہوتا ہے، پھر یہ ہر مومن قوم کے ساتھ چلتی ہے، ہم نے اسے قرآن کریم سے پچھلی قوموں کی داستان اور انبیا کی ملتوں اور مومنین کے حالات سے اخذ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس عظیم تاریخی محنت میں مجھے مقدمات کو ترتیب دینے کی سعادت میسر آئی ہے۔

سورہ والعصر اور اسلامی تہذیب کے عناصر

قرآن پاک میں ایک سورۃ ہے جو اپنے معانی کے اعتبار سے صحابہ کرام کی سورۃ ہے صحابہ آپس میں ایک دوسرے کو اس کی نگہداشت کرنے اور ملاقات اور جدائی کے وقت اسے پڑھنے کی تاکید کرتے تھے، اور امام شافعی نے تو اس کے بارے میں کہا ہے "اگر قرآن میں صرف یہی ایک سورۃ ہوتی تو بھی لوگوں کے لئے کافی ہوتی" یہ سورہ "والعصر" ہے

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝

زمانہ کی قسم انسان درحقیقت گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

یہ سورۃ جب کہ آپ دیکھ رہے ہیں تہذیب کے تمام عناصر کا پوری وضاحت سے احاطہ کرتی ہے، انسان، اجتماعیت، زمانہ، رنگ۔ اس طرح یہ سورۃ مسلسل تہذیبی عمل پر بھی مشتمل ہے عمل اور مبادی اور اصولوں کا نفاذ۔ اس سورۃ میں بڑے عمیق اشارات بتاتے ہیں (جن کی وضاحت ہم آگے کریں) کہ نفاذ کا تعطل تہذیب کا تعطل ہے اور اس سے جمود لازماً پیدا ہو جاتا ہے۔ اور از سر نو نفاذ کامل اور تیاری امت کے انتظار میں تہذیب کو ڈال دیتا ہے۔

فصل ۲

اسلامی تہذیب کے ضوابط

فصل ۲

اسلامی تہذیب کے ضوابط

انسان اور تہذیب

تہذیب اور نظام

ہدایت اور قانون میں وحدت

ریاست اور تہذیب

اسلام کا نظریۂ ریاست

ریاست کا کام تشکیل تہذیب نہیں

ریاست ایک ابھری ہوئی لکیر ہیں آگے بڑھتی ہے

تہذیب کی تشکیل میں صحت مند قیادت کا رول

منتخب گروپ اور اولین ذمہ داری

منتخب گروپ اقرار وانکار کے درمیان

خالص زبان تہذیب کا حصہ ہے

ابن تیمیہ اور عربی زبان

غیر عرب مسلمانوں کی عربی میں مہارت

چونکہ تہذیب ایک متعین جگہ اور ایک یا چند زمانوں میں زندگی کے اصول و تصورات کے مجموعے کے عمل کا نام ہے اور ایک خاص نظریاتی تصور کے مطابق انسانوں کی فلاح کے لئے، ارد گرد پر محیط کائنات کے ساتھ انسانوں کے تفاعل کو تہذیب کہتے ہیں اس لئے ان اصول و تصورات کے مجموعہ پر ضروری ہے کہ وہ تہذیب کے اساسی عناصر میں پیدا ہونے والی مشکلات کو حل کرے اور ان کا مقابلہ ایسے ضوابط و قواعد کے ذریعہ کرے جو ایک طرف ان مشکلات کو حل کرنے پر قادر ہوں اور دوسری طرف تہذیب کی بڑھتی رفتار کی نگہداشت بھی کر سکیں۔

یہ تہذیبی ضوابط مستعار نہیں ہوتے بلکہ ذاتی ہوتے ہیں جو ان عقائدی تصورات کے مجموعہ سے پھوٹتے ہیں جو تہذیب کے پس پردہ محرک ہیں۔ اور ان ضوابط میں جس قدر گہرائی و گیرائی ہوگی اسی قدر تہذیب چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے گی اور ان پر غالب آ سکے گی۔

جو تہذیب ان ضوابط سے خالی ہوتی ہے وہ بلاشبہ وہی تہذیب ہوتی ہے جو اپنے اندر اپنے زوال و انہدام کے اسباب پنہاں رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے زندگی اور ارتقاء کے اسباب کھو دئے ہیں۔

ان ضوابط کو ہم مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں[1]

۱۔ عقیدہ اور اس کا فکری روحانی اور اخلاقی اساسی میلانات

۲۔ اصول اور سیاسی، اقتصادی، اجتماعی نظم

۳۔ حکومت، مفہوم اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے

۴۔ عوامی قیادت

۵۔ ایجاد کردہ ذاتی زبان

---

[1] تاریخ تہذیب کے مصنف ول ڈورانٹ نے تہذیب کے چار عناصر گنائے ہیں۔ (۱) اقتصادی ~~بچت~~ (۲) سیاسی نظام (۳) اخلاقی رسوم (۴) علوم فنون کی متابعت

تہذیب اور ضوابط کی ذاتیت

چونکہ یہ ضوابط ہم آہنگ اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ان کا سرچشمہ ایک ہو، جو ان کے درمیان وحدت اور ہم آہنگی کی ضمانت ہو اور تہذیب کی رفتار کو موکد بنانے کے لئے۔ ان ضوابط کے تفاعل کے لیئے یہ دونوں شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لئے ان بہت سی قدیم تہذیبوں کے زوال و انحطاط کا راز معلوم ہو سکتا ہے جو ان میں سے بیشتر ضوابط سے محروم تھیں۔

یہ تہذیبیں اسی قدر زندہ رہیں جس قدر انھوں نے ایک ضابطہ یا چند ضوابط کو قابو میں رکھا۔ اس کے ذریعہ وہ ابھرتے ہوئے تہذیبی مسائل کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوئیں پھر مشکلات و مصائب کا شکار ہوئیں اور ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ اگر ان کے آثار کھنڈروں اور پتھروں کی شکل میں موجود نہ ہوتے تو دنیا کو ان کی خبر بھی نہ ہوتی۔ اسی طرح ضوابط کا یہ مفہوم بتاتا ہے کہ آج مسیحی مغربی تہذیب کیوں اپنی بنیاد سے ہل چکی ہے، اور اس سے حدود استغاثہ کی فریادیں بلند ہو رہی ہیں۔

مغربی تہذیب نے اپنی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ سے ہی ان ضوابط کو ایجاد کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان خود ساختہ ضوابط کے درمیان وحدت و یگانگت کی ضمانت ہو جائے تاکہ مغربی تہذیب کے تسلسل اور ابدیت کی طرف سے اطمینان ہو سکے، اس لئے کہ ٹائن بی کی تعبیر کے مطابق یہ تخلیقی ناموس الہٰی سے ہے۔

مغربی تہذیب کے شگافوں کو پُر کرنے کی کوشش

اس طرح یورپ میں ہر اوّل انتخاب کو منہ کی کھانی پڑی اور سبھی ادوار میں جب ضوابط کے لئے تشکیل شدہ دیوارِ تہذیب میں پڑی ہوئی دراروں کو پاٹنے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے یونان

روم کے ورثہ کو اپنی عطیات کا ماخذ بنالیا اور نظریات و تصورات میں انہیں ترقی دی۔ ان میں سے کچھ نئے دینی رجحانات تھے۔ اور کچھ انسانی عقل و بصیرت کی پیداوار تھے اور کچھ انسان کی ٹھوس ضروریات پر لبیک کہنے کا نتیجہ تھے۔ چنانچہ وہ افکار و فلسفے وجود میں آئے جو انسان، کائنات اور حیات سے بحث کرتے تھے، حالانکہ ان تصورات و مفاہیم میں۔ اختلافات و تضادات بھی موجود تھے، تاہم مغربی زندگی تہذیبی وجود کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ فکر و تصور کے مخصوص ڈھانچوں میں ڈھل گئی اور تہذیبی ضوابط تشکیل پا گئے۔ جن کے ذریعہ فکر، اسلوب اور طریقوں کو دنیا کی مختلف تہذیبوں تک پہونچانے کی کوشش کی گئی۔ اور بڑی سنجیدگی سے ان نقوش میں گم ہو جانے کے ارادے سے دنیا نے مغربی تہذیب کے تصورات اور افکار کو قبول کر لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ اس تہذیب کے ضوابط کی اشاعت و استحکام کا مطلب یہ ہے کہ اسے دوام حاصل ہوگا اور انفرادیت عالمگیریت سے بہرہ ور ہوگی۔

یہ مختصر سی تلخیص ہے ان افکار و نظریات کی جنہیں آرنلڈ ٹائن بی، اور ہانز کاہن نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔

یہاں اس اہم فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ایک ضوابط وہ ہوتے ہیں، جو ان افکار و تصورات کے مجموعہ سے تراشے جاتے ہیں جن میں باہم کشمکش ہوتی ہے اور ان میں وحدت اور ربط نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دوسرے ضوابط وہ ہوتے ہیں جو ذاتی ہوتے ہیں اور خود اصولوں سے جنم لیتے ہیں۔ بلکہ وہ خود عقیدہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تہذیب وجود پذیر ہوئی اور اس کے ساتھ اس کے مختلف ضوابط بھی وجود میں آئے نہ وہ تہذیب کے تراشے ہوئے ہیں اور نہ اس سے مستعار یا دوسرے سرچشموں سے مدد کے طلبگار کہ وہ اپنے حدود و ضوابط کے نقوش کی ترسیم کر سکیں۔

اسلام تہذیبی ضوابط کی ذاتیت کا مالک ہے

تمام ادیان ومذاہب اور افکار وتصورات میں تنہا اسلام ہی ضوابط کی ذاتیت ان کی وحدت اور ہم آہنگی کا مالک ہے اس سے اس دین کی عظمت موکد ہوتی ہے۔ اور "اسپنگلر تہذیب" کا اطلاق صرف اس پر صادق آتا ہے، کیونکہ ٹائن بی کی تعبیر کے الفاظ میں صرف یہی دین "تخلیق ناموس الٰہی" سے تعلق رکھتا ہے اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ قابل تعجب نہیں ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران ۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے) اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ ۳) آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے

تہذیبی دور

اس دقیق مفہوم کو عام بنانے کے لئے بہت سے مفکرین فلاسفہ اور محققین نے کوششیں کیں۔ افسوس کہ ان میں علامہ ابن خلدون بھی شامل ہیں جن کے سامنے یہ مسئلہ اسی سیاق میں آیا۔ اور اس کی وجہ ناقص استقراء اور غیر متعلق تعلیل تھی۔ ان لوگوں نے یہ کوشش کی کہ تہذیب کا ایک دور متعین کریں، جس سے گزرے بغیر اور اس کے مراحل کو طے کئے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو۔ کیونکہ تہذیب جنم لیتی ہے، نشو ونما پاتی ہے۔ جوان ہوتی ہے پھر اس پر بڑھاپا طاری ہوجاتا ہے اور پھر وہ موت کا شکار ہوجاتی ہے۔ اس کی مثال ایک انسان کی ہے جس کی ایک متعین عمر ہوتی ہے۔ پھر اس تہذیب کے مرنے سے پہلے یا بعد میں کسی اور جگہ کوئی دوسری تہذیب اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ دائمی دور" جیسا کہ نطشے نے کہا ہے تہذیب کی تقدیر ہے۔

اگرچہ ابن خلدون کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ انسانی عمر کی طرح تہذیب کی بھی ایک

عمر متعین کریں مگر یہ مالک بن نبی پر منطبق نہیں ہوتا جس نے موجودہ صدی پائی ہے۔ یہ بات طے ہے کہ وہ تہذیبی دور کو قبول نہیں کرتے اور کم از کم اسے اسلامی تہذیب پر چسپاں نہیں کرتے۔

تہذیبوں کا پہاڑ

جبکہ مغربی تہذیب نے زندگی سے متعلق مفاہیم وتصورات کے مجموعے کے تحت خود ساختہ متناقض تصورات کو دوام عطا کر دیا تو مراحل تہذیب کی ایک دوسری تفسیر سامنے آئی۔ لوگوں نے عالمی تہذیب کو بلند قامت پہاڑ سے تشبیہ دے دی جس کے کئی درجات ہیں۔

بعض تہذیبیں وہ ہوتی ہیں جو پہاڑ کی وادی میں رہ جاتی ہیں۔ اور بعض تہذیبیں چند درجات تک بلند ہوتی ہیں۔ اور کچھ تہذیبیں تھوڑی چڑھائی پر چڑھنے کے بعد رک جاتی ہیں، اور کچھ تہذیبیں چوٹی تک پہونچ جاتی ہیں وہ وہاں مقیم ہوتی ہیں اور اپنی ضیا بار کرنوں سے نوع انسانیت کو مسلسل فیض پہونچاتی ہیں۔[۱]

اور جن لوگوں نے تہذیبوں کی تفسیر میں یہ روش اختیار کی جیسے سان سائمن وہ یہ دعویٰ کرنا چاہتے تھے کہ مغربی تہذیب کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ وہ اب چوٹی پر فائز ہے اور وہاں سے وہ دائمی زندگی کے ساتھ مسلسل ضیا باری کر رہی ہے (ارنلڈ اور ہانز کا بن)

یہ پہاڑی نظریہ "دائمی دور" والے نظریہ سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن ہمارا اختلاف اس نظریہ کے علمبردار کے ساتھ ارتقاء، تسلسل، ابدیت اور ضیا باری کی مستحق تہذیب کی نشاندھی میں مضمر ہے۔ وہ تہذیب جو ضوابط کی ذاتیت کی مالک ہے (اسلامی تہذیب) یا وہ تہذیب جو باہم متناقض افکار کے ذریعہ ضوابط کی تشکیل کرتی ہے۔ (یعنی مسیحی مغربی تہذیب جو رومی یونانی اصول کی علمبردار ہے)

---

[۱] حسین مونس الحضارة

لیکن ساتھ ہی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ اسلامی تہذیب ایک مرحلہ میں اس تعطل کی وجہ سے کارناموں اور عطیات contributions سے دور رہی جو اس کے اکثر ضوابط پر طاری رہا۔ اسلامی تہذیب کے کارناموں کے موقوف ہونے کی وجہ یہی ہے۔ حالانکہ اس تہذیب کا عطیہ ہی وہ جمہوری وسعتیں secretions ہیں جن میں مسلسل تجدید ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ حرکت پیہم میں لگے رہتے ہیں تاکہ تہذیب اسلامی کو توقف اور تعطل کے مرحلہ سے نکال کر از سر نو کارناموں اور عطیات کے مراحل میں داخل کریں۔

ان میں ہی یہ راز پوشیدہ ہے کہ اسلامی تہذیب فرہنی حملوں کے سامنے ثابت قدمی کے ساتھ کھڑی ہے اور نشٔے مالک بن نبی کی تعبیر کے مطابق دائمی دور کے نظریہ یا ہماری تعبیر کی رو سے ناقص دور کے انحطاط وانہدام پر غالب ہے۔

انسان اور تہذیب

ہر زمانے میں ثابت انسان

ہم نے تہذیب کی تعریف میں کہا ہے کہ تہذیب کے عناصر میں انسان — جسم، روح اور عقل کے تمام معنوں کے ساتھ — اور معاشرہ جس میں وہ اجتماعیت کی شکل میں رہتا ہے اور اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے، اور وہ زمانہ شامل ہے جس میں زندگی کے بارے میں مجموعہ مفاہیم جن کا انسان معتقد ہے تفاعل کا عمل جاری ہے

اسی طرح تہذیب میں انسان ایک نمایاں بلکہ اہم ترین عنصر ہے کیونکہ وہی وقت کو موڑ سکتا ہے اور زمین کا رخ بدل سکتا ہے یا جس پر ایک متعین زمانہ یا معلوم حد میں کائنات سے استفادہ ضروری ہے۔ اگر انسان نہ ہو تو تہذیب کا وجود نہ ہو اور کائنات کا اور زندگی کے معانی کا ادراک نہ کیا جا سکے۔ تہذیب اس کے دم سے ہے اور اس کی فلاح وسعادت کی خاطر ہے اسی طرح تمام اقدار اسی کے لئے۔ اس کے وجود کی تنظیم کے لئے اور اس کے مقصد وجود کی تحصیل کے لئے ہیں۔

اور انسان کا حال یہ ہے کہ وہ واحد ہے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، وہ ارد گرد کے حقائق کے ادراک، احتیاجات، جسد، روح، عقل اور طبیعتوں وغیرہ کی خصوصیات اور بنیادی ~~خصوصیات سے اختلاف~~ کرتا ہے۔ گرچہ یہ امتیازی صفات تمام انسانوں اور تمام قوموں میں الگ

الگ ہوتی ہیں ایک قوم کی بنیادی خصوصیات ارتقا کے مرحلہ تک پہونچ جاتی ہیں اور دوسری قوم میں وہ آغاز کے درجہ ہی میں جامد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یا اس سے بھی پست درجے میں گر جاتی ہیں او بلند آرزوں کے مطابق ان کو صیقل کیا جاتا ہے یا مہمل چھوڑ دیا جاتا ہے۔

یہ بات ادراک سے ثابت ہے کہ تمام قوموں اور تاریخ کے تمام ادوار میں انسان غیر متغیر اور ثابت رہا ہے۔ وہ اپنے پہلے وجود سے آخر وقت تک ایک قسم کی خصوصیات اور ایک ہی نوع کی ضروریات رکھے گا۔ وہ حس و شعور الطبائع اور روح، آرزوؤں اور ضروریات، تمناؤں اور مصائب کا انسان رہا ہے۔ اس کے بعد بنیادی ضروریات میں ترقی کے درجات ناقابل لحاظ ہیں البتہ وہ تمام انسانوں میں بنیادی طور سے موجود ہے۔ خواہ وہ کسی بھی ماحول میں پیدا ہوا ہو اور کسی بھی زمانے میں اس کی تخلیق ہوئی ہو۔ اور خواہ اس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ ہو، وہ خیموں میں رہتا ہو یا محلات میں، بدوی ہو یا مدنی، گاڑی سے چلتا ہو یا چوپایوں سے — یہ سب جزئی مظہری امور ہیں جن کا فکری و فلسفیانہ کارناموں سے بس محدود مقدار میں تعلق ہے۔ انسان واحد ہے ایک جسم کی شکل رکھتا ہے اور ایک قسم کی خصوصیات و ضروریات رکھتا ہے۔ اور وہ احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔

یہاں دوسرے نظریات سے اسلامی نظریہ مختلف ہے۔ دوسرے نظریات انسانوں کو رنگ و نسل کی بنیاد پر مختلف قرار دیتے ہیں۔ سفید رنگت کو منتخب کر لیتے ہیں کہ کالی رنگت کو ذلیل کرے اور سرخ رنگت پر تفوق و برتری کو جائز سمجھے اور آریائی نسل کی سفید رنگت ان سب پر حکمرانی کرے اور زندگی و سعادت کے استحقاق میں اسے افضل و اوّل قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری قوموں کی ثروت و دولت اور وسائل و ذرائع کو لوٹنے کے لئے یوریین کو حق دے دیتے ہیں۔

اس نظریہ کو جائز اور مکمل کرنے کے لئے اس کے موجدوں نے ان مکانی و فضائی حالات کو دیکھنا شروع کیا جن میں کالی نسل رہتی تھی تاکہ اس کی پسماندگی اور تہذیب کی تشکیل پر اس کی عدم قدرت کا اثبات کر سکیں حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اتنی جسارت کا ثبوت دیا کہ کالی نسل کو انسانی نسلوں کی فہرست ہی سے خارج کر دیا اور اس کا شکار کرنا، اس کی تجارت کرنا جائز قرار دے دیا۔

جس طرح ان لوگوں نے انسان کے اندر اس نسلی امتیازی فلسفہ کے اثبات کے لئے ان ظواہر کا استحصال کیا اسی طرح انھوں نے انسان کے اور اس کی ایجادات کے درمیان ربط ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی چنانچہ انھوں نے پہلے انسان سے اس کی انسانی خصوصیات چھین لیں اور اس کی تصویر کشی اس طرح کی کہ وہ آگ اور مٹی کے سامانوں اور معدنیاتی وسائل کے پیچھے زبان نکالے دوڑ رہا ہے چنانچہ ان کے ذریعہ اس نے انسان کا تعارف کرایا تجاہل کہ انسان کے ذریعہ ان وسائل کا تعارف کراتا یہاں تک کہ عقل انسانی جو خدا کی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے اس نے انسان کو متمتع کیا اور جس کے ذریعہ انسان قابل تکریم ٹھیرا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل - ۷۰)

(اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی)

اسے بھی انھوں نے انسانی ایجاد قرار دے دیا۔ اس طرح ان کے خیال میں ہزاروں سال پہلے انسان اس حال میں تھا کہ اس کے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہ تھی یہاں تک کہ جب اس نے اس کا ادراک کیا تو عقل اس کی پہلی ایجاد تھی اور اس کے بعد سے تہذیب کی طرف اس نے پہلا قدم بڑھایا۔[۱]

---

[۱] حسین مونس الحضارۃ ص - ۱۰

اسلام کا نظریۂ انسان

رہا اسلامی نظریہ تو وہ ان تمام الجھنوں اور گتھیوں سے آگے ہے جنھیں جھوٹے علمی لبادے پہنا دئے گئے ہیں۔ سائنس آئی تو اس نے اس سے برآت کا اعلان کر دیا۔ جیسا کہ جنس و رنگ کی بنیاد پر افضلیت کے نظریہ کا حال ہے ۔۔ اور نتیجہ کے طور پر اس نے اسلام کے اس نظریہ کا اثبات کر دیا کہ ہمارے انسان یکساں ہیں ایک ہی طرح کی خصوصیات رکھتے ہیں اور ایک ہی قسم کی بنیادی ضروریات ان سب کی ہیں۔ وہ سب بہترین خلقت پر پیدا کئے گئے ہیں تاکہ انسان اپنی سعادت و کامرانی حاصل کر سکے اور حیات و وجود میں اپنے کردار کو انجام دے سکے وہ یا تو کمال کے زینوں کو طے کرے یا گہری و خوفناک کھائیوں میں گر جائے چاہے وہ ایجادات و اکتشافات کا مالک ہو۔

کیا تباہی و بربادی کے یہ آلات و وسائل جن کی آج یہ متمدن قومیں مالک ہیں اور جنھیں انسان نے اپنی ہلاکت کے لئے ایجاد کئے ہیں۔ اسی طرح ترقی یافتہ مہذب معاشروں میں اخلاقی انارکی اور اباحیت پرستانہ معیارات ۔ کیا یہ ساری چیزیں انحطاط و تنزل اور اسفل السافلین کے درجہ میں نہیں رکھی جائیں گی ؟

انسان روز اول سے صاحب عقل ہے

اسی طرح اسلامی نظریہ کے مطابق انسان اپنی تخلیق کے اوّل روز سے ہی صاحب عقل ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (البقرہ - ۳۱)

(اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔)

پھر اس پر دنیا کی ذمہ داری ڈالی گئی۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ - ۳۸)

(ہم نے کہا کہ تم یہاں سے اتر جاؤ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہونچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔)

چنانچہ انسان کے جوہر میں آدم و شیطان کی جو کشمکش ہے وہ اس بنیاد پہ ہے کہ وہ کس حد تک چیزوں کو سمجھتا، ان کی حدود کا ادراک کرتا ہے، اور ان کے سلبی و ایجابی پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اور اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے۔ جس طرح قابیل و ہابیل کی کشمکش نے اس رنگ کو اختیار کیا جب کہ ایک پر عقل و ہدایت کی حکمرانی تھی اور دوسرے پر خواہشِ نفس اور طبیعت کا غلبہ تھا چنانچہ اس نے جرم کا ارتکاب کر دیا پھر اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش چھپائے تو ایک پرندے نے اسے اپنے عمل سے تعلیم دی۔

يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوْءَةَ اَخِىْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ○ (المائدہ - ۳۱)

(افسوس ~~مجھ پر میں اس~~ کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش

چھپانے کی تدبیر نکال لینا اس کے بعد وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا)
اسلامی نظریہ کا فیصلہ ہے کہ وہ ایسی روح جو پہلے انسان کے اندر حلول ہوئی

فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوحِنَا (الانبیاء - ۹۱)

(اور ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی)

اسی نے انسان کے اندر وہ خاص صلاحیت پیدا کی جو ملائکہ، حیوانات، جمادات، اور دوسری مخلوقات پر برتری و تفوق رکھتی ہے۔ اسی نے انسان میں ذات کا شعور پیدا کیا اور کائنات و حیات کا شعور بخشا اور اسی نے انسان کو ادراک اور دوسری متعلق خصوصیات و صلاحیتیں عطا کیں۔

انسان میں شعور کی تخلیق

انسان کے اندر شعور و ادراک کی صلاحیت اسی وقت پیدا ہو گئی جب اس جسد خاکی میں اللہ کی روح ڈالی گئی۔ اور یہ جسم کا مادہ ایک عاقل ذات میں تبدیل ہو گیا، جو غور و فکر، ادراک و احساس، تمیز و شعور کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جو اپنی ذات کی معرفت اور اپنے گرد کے ماحول کی معرفت پر قدرت رکھتی ہے اور وہ اپنی ذات اور محسوس و مشاہد اشیاء کے درمیان رابطہ کی تخلیق پر بھی قادر ہے اور مہارت کے ساتھ ان اشیاء میں انتخاب و تمیز بھی کر سکتی ہے۔

اس صلاحیت کی گہرائی و گیرائی کا راز اس روح میں مضمر ہے جو اللہ نے اس انسان کو عطا کیا ہے۔ گویا وہ خدا کے علم کا ایک حصہ ہے۔ جس میں سے ایک معتد بہ حصہ نے اس عجیب و غریب مخلوق کو دے دیا ہے تاکہ اس کی تکریم و تعظیم ہو اور اس مقدس فرض کی انجام دہی کر سکے جو اللہ نے اسے سونپا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ، اور زندگی کے
(البقرہ - ۳۰)

(اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

چنانچہ حضرت آدمؑ جیسا کہ ہم پیچھے کہہ چکے ہیں ـــــ پہلے انسان ہیں۔ آپ نے اشیاء کو ان کا نام دینے کی کوشش کی۔ یعنی ان سے تعارف حاصل کرنے کے بعد ان کا شعور حاصل کیا یا دوسرے معنوں میں ان کی صفات و خصوصیات جاننے کے بعد ان کے اندر تمیز و انتخاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔[1]

بلاشبہ یہ شعور، یا ادراک یا ہمہ گیر معنی میں یہ "معرفت" ترقی کرے گی جیسے جیسے انسان اور اس کے اردگرد کی کائنات کے درمیان تعلق مستحکم ہوگا۔ چنانچہ اردگرد کے ماحول سے تعلق اور وجود سے ربط اس وقت تیز ہوگا اور مستحکم رابطہ اسی وقت قائم ہوگا جب اس کی "معرفت" میں اسی قدر گہرائی ہوگی، اور بے حد و نہایت وسعت اس کے شعور میں پیدا ہوگی۔

---

[1] ول ڈیورانٹ اپنی کتاب تاریخ تہذیب جزو اول ص ۱۲۶ میں کہتا ہے: کلمہ انسان کی ابتداء ہوئی۔ اگر یہ آوازیں نہ ہوتیں جنھیں ہم کلی طور پر اسماء کہتے ہیں۔ تو ہم جزئی اشیاء میں فکر کو محصور نہ کر پاتے اور غالب گمان یہ ہے کہ اگر یہ کلی اسماء نہ ہوتے تو فکر انواع کا دوسری اشیاء سے متمیز کر کے نہ ادراک کر پاتی نہ صفات کو اس کی ان اشیاء سے ممیز کر کے دیکھ پاتی جن سے وہ متصف ہیں نہ اشیاء کو ان کی صفات سے مجرد کر کے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے

شعور، روح اور مادہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعور روح کی ایک خاصیت ہے۔ وہ بلند تنظیم مادہ کی خصوصیت نہیں ہے جیسا کہ انجلز کہتا ہے۔[1]

ان دونوں اسلامی و انسانی نظریات میں عیّں فرق یہ ہے کہ اسلام انسان کو اوّل روز ہی سے صاحب عقل گردانتا ہے، اور اسے ذمہ داریوں کا مکلف قرار دیتا اور راہ ہدایت کو اس کے سامنے پیش کرتا نظر آتا ہے۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ - ۳۸)

(پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہونچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

لیکن تاریخی و فلسفیانہ نظریات کا معاملہ مختلف ہے وہ انسان کو ـــــ بہترین حالات میں ـــــ اس کی ادراک اس کے طریقے اور اس کی سعادت و فلاح کا تنہا موجد بناتے ہیں اور اسے یکا و تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ جو نظریات اور قوانین چاہے بنالے۔

"بہترین حالات کی قید ہم نے اس لئے لگائی ہے کہ بدترین حالات میں وہ اسے بندر یا بندر سے متعلق قرار دیتے ہیں پھر یک طویل زمانے اور ایک لمبی مدت کے بعد وہ انسان کا درجہ حاصل کر پاتا ہے۔

---

[1] دیکھئے ہماری کتاب۔ الطریق الی حکم اسلامی

ان دونوں نظریات کے نتائج میں جو زبردست فرق ہے اس سے قطع نظر آج اہم ترین بات یہ ہے کہ غیر اسلامی نظریات نے رجعت شروع کر دیا ہے تاکہ اسلامی نظریہ سے ہم آہنگ ہو سکے۔ چنانچہ اب وہ کہنے لگے ہیں کہ "انسان ایک قائم بالذات جنس ہے اور اس صورت میں انسان کا بندر سے یا اعلیٰ ذات کے بندروں سے ربط جوڑنے پر اصرار کرنا بے معنی ہے" اور یہ انسان ــــ چاہے اس کی جنس کتنی ہی تبدیل ہو جائے ــــ کچھ ذہنی جسمانی خصوصیات رکھتا ہے جو زندگی کے ساتھ اس کے طویل سفر میں اس کے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔[۱]

---

[۱] حسین مونس، الحضارۃ ص ۱۸/۱۹

تہذیب اور نظام

اپنی خصوصیات میں ثابت انسان ثابت نتائج والی تہذیب کا محتاج ہے۔

جب ہم ہر دور کی تاریخ اور ہر زمانے کے انسان کا اسلامی نظریہ کی روشنی میں مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں تو پورے شرح صدر اور قلبی اطمینان کے ساتھ ہم اسلامی نظریہ کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ انسان اپنی خصوصیات و لوازمات میں ثابت ہے

اس فیصلہ کے ساتھ ہمارے لئے اس فیصلہ تک پہونچنا بھی ممکن ہے کہ انسان کی بشری خلقت کا یہ ثبات طریقہ و تہذیب کے ثبات کا محتاج ہے جس کی جڑیں ثابت نتائج اور ثابت تصور تک ملی ہوئی ہوں اور وہ جمود سے ناآشنا ہوں یا سید قطب کے بقول "ایسے تصور کی ضرورت ہے جس کے اندر فریم کے دائرے میں حرکت ہو اور ثابت محور ہو" اور زندگی و مظاہر کے تغیر کے لئے ناگزیر لچک کے ساتھ طریقہ و منہاج کا یہ ثبات تنہا اسلام کی ملکیت ہے اور اس میدان میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

اس طریقہ کے حامل اسلامی نظریہ نے مسلمانوں کو کائنات انسان، حیات سے متعلق ایسی فکر دی جس کے اندر وحدت ہے تصادم نہیں، گہرائی و گیرائی ہے پیچیدگی نہیں، وضاحت و صراحت ہے التباس و پردہ داری نہیں اور اس طرح زندگی کے نقوش یعنی انسانی ذات اور عجیب و غریب کائنات واضح اور عیاں ہو گئے۔

بندگی کی تکمیل میں آزادی کی تکمیل ہے

یہ ثابت و مستقل اصول جو وجود انسانی کی غایت ـــــ جس کا مقصود خلافت الٰہی کی تحصیل ہے ـــ سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انسان کو ساتھ لے کر معرکہ آرا ہوتے ہیں اور اللہ کی بندگی کے سوا جو وجود کی علت ہے تمام بیڑیوں سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اور اللہ کی مکمل بندگی میں مکمل آزادی ہے۔ جیسا کہ ابن خضر دیہ کہتا ہے کیونکہ اللہ کی معیت میں انسان آزاد ہے اور آزادی و وجود دونوں متحد ہیں۔ یہ آزادی انسان کو حرکت اور سربلندی عطا کرتی ہے اس کے ذریعہ انسان ان اقدار کے سوا کسی کا پابند نہیں ہوتا جو اس کے آزاد وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اور اس بلند اعزاز کو پائیدار بنانے کے لئے نافذ کئے گئے ہیں۔

اسلام مطلق عقیدہ کی خدائے عزوجل کے ساتھ ترسیم کرتا ہے اور یہ وہ عقیدہ ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں نہ کوئی تصنع و تکلف ہے۔ یہ عقیدہ وحدانیت۔ خلقت، ارادہ، علم اور الٰہی و ربانی جیسے کامل صفات میں اسے تنہا قرار دیتا ہے۔ تاکہ بندہ آزاد مطمئن ہو کر ایک ایک بے نظیر خدا کی عبادت کرے۔ اسی کو راضی و خوش کرے۔ اسی سے لو لگائے اور اسی کی رہنمائی اور اصولوں سے دلچسپی لے۔

عقیدہ سے متعلق اور کائنات انسان اور حیات کے تصورات سے متعلق بنیادی اصولوں کے پہلو بہ پہلو یہ اسلامی تنظیمات اس امر کی ضمانت بھی فراہم کرتی ہیں کہ عقائدی اصولوں کو زندگی کے مختلف شعبوں سے ایک مضبوط و مستحکم بندھن سے جوڑنے کے بعد ان میں نافذ بھی کریں گی۔

ایک ہی نظام سے زندگی کو منضبط کرنے کا عمل

ایک ایسے نظام میں زندگی کو منضبط کرنے کا عمل جو تصور کی گہرائی کے ساتھ متفق اور انسان کی خصوصیات کے ساتھ ہم آہنگ ہو خود ربط و تعلق پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ نظام ضبط کے تسلسل اور انحراف کے روک تھام کے سلسلے میں جواب دہ ہے۔ لوگوں کے خط مستقیم پر باقی رہنے اور ان کے اندر شعور و مفاہیم کی وسعتوں کو اتارنے کا ذمہ دار ہے۔ اور ان کی ابھرتی نسلوں کے اندر ان تصورات اور اصولوں کو پیوست کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کے سر عائد ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں اس تصور کی اشاعت کا بھی ذمے دار ہے تاکہ تمام لوگ اگر ممکن ہو سکے ایک ہی راہ کے، ایک ہی طریقے کے حامل اور ایک ہی تہذیب کے علمبردار ہوں۔

انسانوں کی کسی جماعت کی زندگی راہ راست پر اسی وقت رہ سکتی ہے جب ان کا نظام حکومت اور ان کی سیاسی و معاشی و اجتماعی تنظیمات کائنات، انسان اور حیات سے متعلق ان کے تصور سے ماخوذ ہوں اور انسانوں اور ان کی تنظیمات کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں کے درمیان روحانی تعلق کا وجود ہو اور دونوں میں گہرا تعلق پایا جاتا ہو۔

تنظیمات میں ثبات اور لچک

تنظیمات کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ لچکدار ہوں اور یہ لچک خود ان اقدار میں موجود ہو جنھوں نے ان تنظیمات کو وجود بخشا ہے۔ چونکہ یہ تنظیمات ہر زمان و مکان کے انسانوں کو خاص کرتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان سرگرمیوں کے عوامل کے دقیق و جامع فہم کے ساتھ

تغیر و ترسیم کے عوامل کو نگاہ میں رکھیں۔ جس طرح اسلام واضح عقیدہ اور بسیط تصور رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ ایسی تنظیمات کا بھی حامل ہے جو اس کے تصور کے ثبات کی ضامن ہیں اور اس کی بلند فکر کو صحت مند حیاتیاتی واقعہ کا لباس پہنانے کی کفیل ہیں۔ اس وجہ سے اسلامی تنظیمات زندگی کے پیچیدہ اور اہم مسائل کو حل کرتی ہیں۔

انسانی سرگرمیوں پر حکمرانی کرنے والی اسلامی تنظیمات کی بنیاد انسانی ضروریات اور ہر دور میں ان میں تبدیلی وارتقاء کے امکان کی بنیادی معرفت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی تنظیمات تغیر پذیر ہیں اور حالات کے ساتھ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہیں گویا ان کا کوئی بنیادی رنگ ہی نہیں ہے۔ اسلامی تنظیمات عام حالات میں ثابت ہیں وہ ایسی بنیادیں رکھتی ہیں جن سے خروج وانحراف ممکن نہیں ہے۔ لیکن وہ تنظیمات لچکدار بھی ہیں اور ارتقاء کو قبول کرنے والے مسائل ہیں اور ان اشکال ورسوم میں تغیر وتبدیل کے تئیں ان کا رویہ نرم ہے جن کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ وہ ایک متعین حالات یا صورت واقعہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اس طرح دوسری تمام تنظیمات کے خلاف تنہا اسلامی تنظیمات ہی میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ان کی بنیاد میں ثبات ہے اور انطباق وتنفید میں لچک ہے یعنی یہ انسانی ترکیب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور وہ زندگی کے غیر متغیر گوشوں میں جیسے نجی حالات اور خاندانی زندگی میں تفصیل بیانی میں ممتاز ہیں۔ اور زندگی کے دوسرے ان پہلوؤں میں جہاں ارتقاء وتغیر کی گنجائش موجود ہے لچکدار اصولوں میں اجمال اور کم بیانی میں انہیں امتیاز حاصل ہے۔ جیسے اقتصاد، اجتماعیات، مالیات، شوریٰ اور مملکیت کے مختلف نظام جہاں کافی لچک اور نرمی پائی جاتی ہے۔

ہدایت وقانون میں وحدانیت

"ہر زمان ومکان میں انسان بڑی آسانی سے حیاتیاتی اسلامی تنظیمات پر اعتماد کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر سکتا ہے چنانچہ یہ تنظیمات سے دائمی شکل میں نجات وفلاح کے اسباب سے ہمکنار کرتی ہیں، اطمینان وسکون کے نتائج سے نوازتی ہیں اور اعلیٰ تہذیب کے اصولوں سے اس کی زندگی کو مزین کرتی ہیں" اور یہ اتفاقیہ نہیں ہو جاتا اسلام نے اپنی تنظیمات کو کائنات، انسان اور حیات سے متعلق اپنے ہمہ گیر فکر سے اور اس انسان کے مقصد وجود سے مربوط کر دیا ہے اس طرح سے کہ ہدایات وتوجیہ کی آیات ہی میں قوانین ونظامہائے حکومت وسیاست واجتماعیت کے اصول بھی بیان کر دیئے گئے ہیں یہ ربانی اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ قوانین وہدایت کے درمیان مضبوط ومستحکم رابطہ ضروری ہے یہ اشارہ اہم حقیقت پر زور دے رہا ہے جس سے اکثر لوگ اور دوری نظریات کے علمبردار غافل رہے ہیں وہ یہ کہ ہدایت وقوانین میں عمیق وحدت ضروری ہے اور ان میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر تہذیب کو مسلسل عطیہ سے فیضیاب کرنا ہے تو ان دونوں کو بنیادی ضابطہ کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔[1]

---

[1] دیکھئے ہماری کتاب الطریق الی الحکم الاسلامی ص ۲۹

ریاست اور تہذیب

تہذیبی ضوابط کی فہرست میں بنیادی تصورات اور مفہوم کے ضمن میں مملکت کا نام آتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ انسان کی نگہداشت کرے اس کی اجتماعیت کی حفاظت کرے، اس کی معیشت کو اس کے لئے آسان بنائے اور انسان و موجودات و ماحول کے درمیان مسلسل تفاعل کے میدان کو وسیع کرے اس طرح سے کہ بحیثیت اجمالی امن، سلامتی خوشحالی و استحکام کا حصول ہو سکے اور یہ کسی بھی تہذیب کو ناپنے کے لئے بنیادی صفات ہیں جو تہذیب اس معیار پر پوری اترنے سے عاجز ہوا ہے سخت آزمائش کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس کا آخری انجام اس کی تباہی و بربادی اور صفحہ ہستی سے اس کی عدم موجودگی کی شکل میں نکلا ہے۔ اگر اس نے دوسرے عوامل و ضوابط سے محرومی بھی اپنے حصے میں لے لی۔

تہذیب کے ضابطہ کی طرح مملکت کا بھی اسلام میں ایک خاص مفہوم ہے جو اسے معروف سیاسی ریاست سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اور اس نظریہ ریاست سے بھی ممتاز ہے جس کی بنیاد پر روسو نے اپنا نظریہ معاہدہ عمرانی (Social contect Theory) ترتیب دیا کہ انسانوں نے آپس میں ایک ایسی مملکت کی تشکیل پر معاہدہ کیا جو ان کے تقاضوں کے مطابق ہو اور قوم یا اس کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلے اور ان کے وجود کے ساتھ ان کا اپنا تمدن قائم ہو۔ پھر ریاست کا یہ مفہوم بدل گیا اور اس میں گروہی ریاست کا مفہوم داخل ہو گیا جہاں ایک مجتمع گروہ حکومت چلاتا ہے یا اس کے قائدین

کی مرضی کے مطابق حکومت چلتی ہے۔ پھر ریاست کا مارکسی نظریہ سامنے آیا جو آخر کار مملکت کے خاتمہ ہی کا علمبردار ہے کیونکہ جب لوگ کمیونسٹ ہو جائیں گے اور اپنی مرضی کے مطابق معاملات کا انتظام خود کریں گے تو ریاست کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ نتیجہ کے طور پر ریاست سرمایہ داری کا مظہر ہے جو جبر و قہر پر قائم ہوتی ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست کے مقاصد کے حصول کے لئے کام کرتی ہے۔[1]

اسلام کا نظریۂ ریاست

اسلامی نظریہ یہ کہتا ہے کہ مملکت یا ریاست اکثریت و اقلیت کے فیصلوں کے تابع نہیں ہوتی اور ریاست زندگی سے متعلق تصورات و مفاہیم کے ضمن میں لازماً موجود ہے یعنی اسلام کی نگاہ میں ریاست انسانی معاہدہ سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس شریعت کے طفیل میں وجود میں آئی ہے جسے لوگوں نے اپنے دین و طریقۂ حیات کی حیثیت سے قبول کیا ہے اس لئے ریاست کا وجود انسان یا قوم کا مرہون نہیں ہے بلکہ شریعت کا مرہون

---

[1] ول ڈیورانٹ اپنی کتاب تاریخ تہذیب میں کہتا ہے جنگیں ہی وہ عامل ہیں جو سرداری تخلیق کرتا ہے اور بادشاہ کو وجود میں لاتا اور ریاست کی تشکیل کرتا ہے ــــ مملکت کی ماں مملکت ہے اور حرب و جنگ اس کا باپ اور سمنر کہتا ہے "ریاست قوت کی پیداوار ہے اور یہ قوت کے سہارے ہی قائم رہتی ہے" ــــ نٹشے کہتا ہے "سیادت کرنے والے غازی جانوروں کی ایک جماعت تمام جنگی نظاموں کے ساتھ انسانوں کے ایک بڑے گروہ پر اپنے پنجوں سے حملہ کر دیتی ہے۔ کبھی وہ تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس نے کوئی ایسا نظام نہ پایا جو اس کے ڈھانچوں کی تعیین کرتا ــــ یہ ہے ریاست کی اصل۔

منت ہے اس وجہ سے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ شریعت کے سامنے سر جھکائے قوم کے سامنے نہیں اور اس کا فرض ہے کہ بلند ترین ماخذ کے مطابق چلے۔

دولت یا ریاست کے مفہوم سے یہ بات بھی خلاصہ کے طور پر سامنے آتی ہے کہ انسان اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اللہ کے ساتھ معاہدوں سے مربوط ہو جاتا ہے اور ان معاہدوں کی کچھ شرائط، واجبات علی الحدہ ہیں۔ اس معاہدہ کی ایک شرط اور ذمہ داری یہ ہے کہ انسان خدا پر گہرا ایمان رکھے اس کی ربوبیت و حاکمیت کا معترف ہو ہر حکم کے سامنے سپر انداختہ ہو اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اور یہ معاہدہ جو اللہ نے اس سے کیا ہے اس کا دنیا میں بدل وہ کامل طریقہ زندگی ہے جو راستے کو روشن کر دیتا ہے اور اسے پورے اطمینان و سکون کے ساتھ مکمل سعادت اور بلند ترین تہذیب تک پہنچاتا ہے اس معاہدے کی تنفیذ کے لئے اور اللہ کے اس مکمل بدل کے ایصال کے لئے ریاست ناگزیر ہے کہ وہ باہم رضامندی کے اس تسلسل کو نگاہ میں رکھے اور معاہدہ کے مضمون کی پابندی میں مدد کرے۔

ریاست اللہ کے حکم سے وجود میں آتی ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ ریاست کے ذریعہ ہی بدل جو طرز حیات ہے ـــــ عطا کرتا ہے اور اہل ایمان اللہ سے کئے گئے معاہدے کو نافذ کرنے پر اسی وقت قادر ہو سکتے ہیں جب کہ ریاست موجود ہو۔

اسی وجہ سے ریاست خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتی ہے۔

اسی وجہ سے ریاست اللہ کی بھی ہے اور انسانوں کی بھی اور اسی وجہ سے اسلام کی نگاہ میں ریاست ایک بڑی ضرورت اور حتمی شئے ہے جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے اور جس کے بغیر زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

ریاست کا کام تشکیل تہذیب نہیں

ہمارے اس قول سے کہ بدل ریاست ہی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاست ہی اس تہذیب کی تشکیل کرتی ہے جو مفاہیم و تصورات کے عمل کا عکس ہے۔ تہذیب کی تشکیل ریاست کا کام نہیں ہے یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جو تفاعل و ممارست کا عمل کرتے ہیں اور بدل ان کی تہذیبی لائن کو خوب واضح کر دیتا ہے، اور آخری مرحلے میں انھیں امن، عدل، کفایت اور خوشحالی میسر آجاتی ہے اور یہی قرآنی مفہوم کے مطابق آسمان و زمین کی برکتیں ہوتی ہیں جو راہ حق پر ثابت قدم رہنے والوں کے لئے خاص ہوتی ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (الاعراف۔ ۹۶)

(اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تو جھٹلایا لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے)

پوری وضاحت و قطعیت کے ساتھ "برکات" کا لفظ ہر شئے کو عام ہے انسان کی اپنی ذات اور اس کا وجود بھی اس میں شامل ہے اس کی پیداوار اور تہذیب بھی اس میں داخل ہے یہ مسلسل و غیر منقطع برکتیں ہیں جن کے دروازے چوپٹ کھلے رہتے ہیں جو بغیر حساب کے عطا کرتی ہیں اور زندگی و ارتقاء کے اسباب و وسائل کے ذریعہ انسانوں کی مدد کرتی ہیں اور تہذیب کی بڑھتی ہوئی لکیریں انھیں آگے بڑھاتی ہیں۔

ریاست ایک ابھری ہوئی لکیر میں آگے بڑھتی ہے

ان تمام اہم اور بڑے نتائج کی واحد شرط یہ ہے کہ معاشرہ طریقہ الٰہی پر مسلسل گامزن رہے۔ شرط تسلسل اور عدم انحراف ہے۔ جب انحراف آجاتا ہے تو بدل کے ایصال سے ریاست رک جاتی ہے اور تہذیب کو زبردست چرکہ لگتا ہے۔

اس طرح اصول کی حیثیت سے ریاست ایک ابھرتی ہوئی لکیر میں نشوونما پاتی ہے اور اسلامی تہذیب کے اہم ضوابط انسانی معاشرے کو آسمانوں اور زمین کی برکتوں کی ربانی حفاظت و نگہداشت سے مالا مال کرتے ہیں۔ یہ حتمیت و قطعیت ہی تعمیر ریاست میں بنیاد ہے اور یہی تہذیب کے ایک ضابطہ کی حیثیت سے مملکت کا تحفظ کرتی ہے۔

ڈاکٹر حسین مونس اپنی کتاب الحضارۃ ص ۷۱ میں لکھتے ہیں "صحت مند سیاسی ڈھانچہ ہی پر ترقی کی ضمانت ہے اس کے بغیر تہذیب کی رفتار کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اگر مسلمانوں نے اپنی شریعت و سنت رسول سے مستفاد سیاسی نظام کا دامن مضبوطی سے پکڑا ہوتا تو ان کی تہذیب کو زوال نہ آتا اور نہ ان کا معاشرہ کبھی منتشر ہوتا۔"

تہذیب کی تشکیل میں صحت مند قیادت کا رول

تہذیبی ضوابط کی فہرست میں سب سے اوپر باشعور صحت مند قیادت کا نام آتا ہے یہ قیادت ہی ہے جو بنیادی کام کے ضمن میں تہذیب کو آگے بڑھانے کی ذمہ داریوں کا ادراک کرتی ہے اور نتیجہ خیز تہذیبی عمل کے تسلسل کے تحت صلاحیتوں کی تربیت و تذکیہ میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

یہاں قیادت سے مراد ہر وہ ذمہ دار ہے جس کے ساتھ ریاست اور قوم تفاعل کا عمل کرتی ہے جس کی ابتدا امام یا سربراہ مملکت سے ہوتی ہے انتہا پولس کانسٹبل پر ہوتی ہے اور اس میں تمام دوسری قائدانہ یونٹیں شامل ہیں البتہ قیادت میں سب سے چنیدہ یا ہراول دستہ وہ ہے۔ جس میں مفکرین، علماء، اور سردار شامل ہیں یہ لوگ قوم کے تمام افراد پر وہ تاثیر رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بجا طور پر تہذیبی اعمال کی پیش رفت یا تہذیبی رفتار میں سستی کی اولین ذمہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے۔

اس منتخب گروہ یا قائدانہ جماعت کی موجودگی اور اسے اولین ذمہ داری کے منصب پر فائز کرنا اس نظریہ کے منافی نہیں ہے " تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ بلکہ ان دونوں نظریوں میں حیرت انگیز اور شاندار تکامل ہے اور دونوں ایک دوسرے کو بڑی خوبصورتی سے مکمل کرتے ہیں کہ اسی طرح تہذیبی پیش رفت کے تسلسل اور اس کے عدم توقف کی ضمانت ملتی ہے۔

چنیدہ گروپ اور اولین ذمہ داری

جس طرح منتخب گروہ اور چنیدہ طبقہ کے حق میں وہ اصول موجود ہیں جو ذمہ داری اور اس کے تقاضوں سے اس امکان کے ساتھ ہم آہنگ ہیں کہ وہ آرزوؤں اور بلند عزائم کو محسوس و مشاہد واقعہ کی صورت میں تبدیل کر سکیں گے اسی طرح باشعور اور صحت مند اصول صحت مند قیادت کے محاسبہ کے حق میں بھی ہے چنانچہ اس چنیدہ گروپ کو اس بات کا احساس رہتا ہے کہ کوئی اس سے بحث و مباحثہ کرنے والا اور حساب کتاب لینے والا موجود ہے دوسرے الفاظ میں عوام کے پاس وہ تہذیبی شعور موجود ہے جس کو نظر انداز کرنا یا اس سے تغافل برتنا ممکن نہیں ہے۔

بلاشبہ ارشاد و توجیہ، اختراع و تخلیق، مستقبل پر نگاہ رکھنے اور اعلیٰ تر کی جستجو میں لگے رہنے کی ذمہ داریاں اور دیگر مسائل منتخب گروہ ہی کے کندھوں پر ہوں گے۔ چنانچہ جس قدر ذمہ داری کا تیز احساس ہوگا اور جس قدر یہ چنیدہ طبقہ سوچنے سمجھنے والی عقلوں کے لئے صحت مند تصورات کا مالک ہوگا اسی قدر تہذیبی مشکلات پر قابو پا سکے گا اور ترقی و پیش رفت کے میدانوں میں امت کو آگے بڑھا سکے گا۔

فلاسفہ اور محققین نے اس چنیدہ طبقہ کی اہمیت سے باخبر کیلئے انھوں نے تمام تہذیبوں اور قوموں میں اس پر گفتگو کی ہے یہاں تک کہ آرنلڈ ٹائن بی نے ہر ترقی کو اس قائد گروہ کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔

منتخب گروپ ـــ اقرار و انکار کے درمیان

ــــ امت و جماعت عافیت میں رہتی ہے جب تک کہ ہر اول گروپ عقلوں اور

وسیع افاق کے ساتھ کام کرتا ہے، ارتقار کا ادراک کرتا ہے اور اپنے زمانے کے مزاج اور زندگی کے نت نئے طریقوں سے واقف ہوتا ہے۔ خدا بھلا کرے اس شخص کا جو اپنے زمانے کو پہچان لے اور اس کا طریقہ راست رہے۔ لیکن جب اس پر اول گروپ کا رویہ انکار کا ہوتا ہے اور یہ طبقہ فکر و تسلیم کے دریچے بند کر لیتا ہے یا اس میں بگاڑ آجاتا ہے یا اس کے افراد میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو اس وقت اس کے ذاتی اغراض روبہ عمل ہوتے ہیں اور صحت مند قیادت کی صفات سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس صورت میں اگر امت یا جماعت کسی دوسری زیادہ باشعور اور سمجھدار ان قیادت کو لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ اپنے تہذیبی سرمایہ کی حفاظت کر لیتی ہے۔ ورنہ اس قیادت کو نہ بدلنے سے اس امت یا جماعت کو وہ مرض لاحق ہو جاتا ہے جسے قیادت کا بانجھ پن کہا جاتا ہے اور یہ وہ اہم مرحلہ ہوتا ہے جہاں امت تباہ و برباد ہو جاتی ہے اس کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں اور اس کا تہذیبی رول رک جاتا ہے۔ اور بسا اوقات بانجھ پن تہذیبی زوال انحطاط کو پہونچا دیتی ہے اگر اس کے تمام ضوابط ختم ہو گئے ہوں۔

اسلام نے قیادت پر بہت زیادہ توجہ دی ہے۔ اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ عوام سے زیادہ ذمہ داری قیادت کی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ زیادہ فہم و شعور کی مالک ہو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ خلافت میں اس مفہوم کی تفسیر اس طرح ہے:۔ "میں تم پر نگراں بنایا گیا ہوں حالانکہ تم سے بہتر نہیں ہوں میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ کے بارے میں تمہاری اطاعت کروں"۔ حضرت عمر بن الخطاب ذمہ داری و جواب دہی کی چوٹی پر پہونچ کر فرماتے ہیں کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ مجھ سے اس جانور کے بارے میں سوال کیا جائے گا جس کو عراق کے دور دراز علاقے میں ٹھوکر لگ گئی ہو کہ میں نے اس کے راستے

کو کبوں نے ہموار کیا تھا۔"

خالص زبان تہذیب کا ایک جزء ہے

تہذیب کے ضوابط میں سے ایک ضابطہ زبان ہے چنانچہ جس قدر زبان بنیادی ہوگی اپنی ذات میں مستحکم اور ٹھوس ہوگی اس قدر اس کے ذریعہ تہذیب ممتاز ہوسکے گی۔

زبان گرچہ قوموں کے درمیان تخاطب و تعارف کا ایک ذریعہ ہے[1] لیکن فکر ثقافت کا اہم ترین اور اولین ذریعہ بھی ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی زبان کسی دوسری قوم تک منتقل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس زبان کی ثقافت، عادات و رسوم، زندگی سے متعلق اس کے تصورات افکار سے اثر پذیری بھی منتقل ہوتی ہے اسی چیز کو "ثقافتی جنگ" کہا جاتا ہے، زبان کا ذریعہ ہونا اس وقت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے اور مکمل تہذیبی ضابطہ میں بہ جبر ڈھل جاتی ہے۔ جب تہذیب کے پاس مکمل اور ہمہ گیر تصورات ہوں جن کا تعلق ماٹن بی کی تفسیر کے مطابق تخلیق ناموس الٰہی سے ہو یا جب وہ زبان ابدی معجزہ کا ذریعہ بن جائے جیسا کہ اسلامی تہذیب کے سلسلے میں قرآن کا حال ہے۔

اس وجہ سے اسلامی تہذیب اور عربی زبان کے درمیان بنیادی و امتیازی تعلق ہے، عربی اسلام کی زبان ہے یہ وہ قالب ہے جس میں اسلام کا قرآنی معجزہ جلوہ گر ہے

---

[1] ول ڈیورانٹ اپنی کتاب تاریخ تہذیب میں کہتا ہے کہ "زبان اشارات کے ذریعہ تعلق کا نام ہے" وہ کہتا ہے "کیا تمہیں کوئی ایسی ایجاد معلوم ہے جو اپنی طاقت و پاکیزگی میں اس کلی نام کے ایجاد کے مساوی ہوسکے"؟۔

یہ وہ حکم ہے جس میں عربی زبان کا سیکھنا اور اس میں مہارت پیدا کرنا اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے۔[1]

دور اوّل کے مسلمانوں نے اس بات کا باقاعدہ اہتمام کیا کہ اسلام میں داخل ہونے

---

[1] آخری زمانے میں ایک نوزائیدہ تنظیم اٹھی جس کا نام "الاتحاد الدولی للمدارس الاسلامیۃ" ہے اور اس کا صدر دفتر ریاض میں ہے اور اس کا بنیادی مقصد ان مدارس کا قیام اور ہمت افزائی ہے جو غیر عرب مسلمانوں کو عربی کی تعلیم دیں۔ اور آخر میں ان کو قابل تسلیم ڈگریاں دیں۔ جن سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس یونین کی تائید اور اس کی اشاعت واجب ہے کیونکہ یہ اسلام کے افہام و تفہیم کا ایک موثر وسیلہ ہے جس میں قرآن اور اسلامی تہذیب کی زبان کے ذریعہ غیر عرب مسلمانوں کو اسلام کی دعوت دی جا سکے۔

اس تنظیم کے بالمقابل لبنان میں ایک سرکاری ادارہ قائم ہے جو وزارت تربیت کے زیر نگرانی بحث و تحقیق کا تربیتی مرکز ہے۔ یہ مرکز ایک اہم منصوبہ جو بنیادی زبان پروجیکٹ کے نام مشہور ہے اور جو ایک عیسائی یونیورسٹی کے ایک مستشرق کا تیار کردہ ہے کے تدریجی نفاذ کا کام کرتا ہے یہاں بنیادی زبان سے مراد لبنانی ماحول میں متواتر الفاظ کو ہٹانا اور طلبہ کو عامی الفاظ کی تعلیم کے لئے مطالعہ و تحقیق کرنا ہے جس سے آخر کار عربی زبان برباد ہو جائے گی اور لبنان اسلامی تہذیب سے الگ ہو جائے گا یہ خطرناک چیلنج ان اہم اور ہولناک تحریکوں کا ایک جزو ہے جن کا مقصد عربی حروف کو لاطینی زبان میں منتقل کرنا یا عوامی لہجے پر اسے قربان کرنا ہے۔ اس سے ہمیں وہ ناکام کوششیں یاد آجاتی ہیں جو عربیت کو ترکی زبان کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ہوئیں .... یہ وہ تمام کوششیں ہیں جن کا بنیادی مقصد عربیت یعنی زبان قرآن و اسلام کا خاتمہ کرنا ہے

والی قوموں کو اسلام کی تعلیم عوامی زبان میں دی جائے چنانچہ دین کے ساتھ زبان بھی ان قوموں کے دلوں میں داخل ہو گئی۔

ابن تیمیہؒ اور عربی زبان

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ "........ یہی وجہ ہے کہ دورِ اول کے مسلمانوں نے شام مصر کو آباد کیا جہاں رومی زبان کی حکمرانی تھی اور عراق و خراسان میں داخل ہوئے جہاں فارسی بولی جاتی تھی اور اہل مغرب کو اسلام سے آشنا کیا جہاں بربر زبان استعمال ہوتی تھی تو ان تمام ممالک میں عربی زبان کی ترویج کی یہاں تک کہ ان ممالک کے مسلم و کافر بھی باشندوں پر یہ زبان چھا گئی۔ اور یہی حال قدیم خراسان کا تھا" یعنی وہاں بھی عربی زبان کا سکہ چلتا تھا۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے کمانڈروں کو وصیت کی تھی کہ "سنت کا فہم حاصل کرو اور عربی زبان میں مہارت بہم پہنچاؤ اور قرآن کو عام کرو کیونکہ وہ عربی میں ہے"۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپؓ نے فرمایا "عربی زبان سیکھو کیونکہ وہ دین کا جز ہے اور فرائض کی تعلیم حاصل کرو کیونکہ وہ تمہارے دین میں ہے"۔

اسی وجہ سے ابن تیمیہؒ کا فیصلہ تھا کہ "خود عربی زبان دین میں سے ہے اور اس کی معرفت فرض ہے واجب ہے کیونکہ کتاب و سنت کا فہم فرض ہے اور وہ عربی زبان کو سمجھے بغیر نہیں سمجھے جا سکتے اور جس چیز کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہوتی ہو وہ واجب ہے"۔

اسلام کا جلال و جمال، اس کی دلفریبی و رعنائی اور اس کا عطیہ و کارنامہ اسی لباس میں جلوہ گر ہو سکتا ہے جو اللہ نے اسے پہنایا ہے، یعنی اس کی منفرد و نرالی زبان جس میں بے نظیر موسیقیت و ترنم ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۔ (یوسف ۲)

ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔

اسی طرح ابن تیمیہ نے عربی زبان کو چھوڑنا اور اس کا نہ سیکھنا دینی اعتبار سے مکروہ قرار دیا ہے ابن تیمیہ کا یہ موقف ہے جو تہذیب اسلامی کو سمجھنے اور اس کی ابھرتی ہوئی رفتار پر اس کی اثراندازی کی حدود وسمتیں منکشف کر دیتا ہے ــــــ اس وقت سامنے آتا ہے جبکہ قوموں اور ملکوں پر عربی زبان کے اثرات کا جائزہ لے چکے ہوتے ہیں چنانچہ یہ کہتے ہیں کہ "جان لو کہ عربی زبان[1] عادت عقل، اخلاق وتہذیب پر مضبوط ومستحکم اثر ڈالتی ہے اور اس امت کے صحابہ وتابعین کی صورتوں سے اس کی مشابہت پر بھی زبردست طور پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے کہ زبانوں کا کردار قوموں کے ان عظیم ترین شعائر میں سے ہے جن سے وہ ممتاز ہوتی ہیں اور

---

[1] مستشرق جیسٹ نے لکھا ہے کہ عربی زبان وہ واحد زبان ہے جو ایجاز وتبلیغ کے ساتھ شاندار نغمگی رکھتی ہے اس نے مثال کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے "انا نحن نحیی ونمیت والینا المصیر" یہ آیت جس نے زندگی موت جزاء وحساب وکتاب کے فلسفہ کا اختصار کر دیا ہے اور کائنات انسان اور زندگی کے سر چشمہ کی یقین کر دی ہے صرف چھ کلمات پر مشتمل ہے۔ جن میں سے پانچ کلمات میں سے ہر ایک میں حرف نون شامل ہے اس سے ایک منفرد قسم کی موسیقیت ونغمگی پیدا ہو گئی ہے جو دنیا کی کسی بھی زبان میں موجود نہیں ہے۔ اس پر غور کرو۔

[2] چنانچہ خراسانیوں کے بارے میں جن کی زبان فارسی تھی کہتے ہیں "انھوں نے زبان کے معاملے میں تساہلی کی اور فارسی میں بات کرنے کے عادی رہے۔ یہاں تک کہ فارسی کا ان پر غلبہ ہو گیا اور ان میں سے بیشتر کو عربی زبان داغ مفارقت دے گئی اور بلاشبہ یہ دینی لحاظ سے مکروہ ہے" دیکھئے اقتضاء الصراط المستقیم۔ ص۔ ۲۰۶۔

اسلام و اہل اسلام کا شعار عربی زبان ہے"۔

غیر عرب مسلمانوں کی عربی میں مہارت

غیر عرب مسلمانوں نے عربی زبان کی یہ اہمیت محسوس کی اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی فرضیت کی حکمت کو اچھی طرح سمجھا کہ اسلام کی طرف انتساب اس کی زبان کی طرف ماہرانہ وحکیمانہ انتساب بھی ہے چنانچہ انھوں نے بغیر کسی احساس کہتری اور شعور ابہام کے عربی زبان پر توجہ دی، اسے تسلیم کیا اور اپنی زبانوں اور انجمنوں میں اسے صداقت اہمیت دی یہاں تک کہ عربی زبان تمام اختلافی زبانوں پر حاوی ہونے لگی اور واحد عالمی زبان قرار پاگئی۔ اگر ایک طرف بعض ممالک نے عربیت کے سامنے پوری طرح سے گھٹنے ٹیک دئے ــ جیسا کہ ابن تیمیہ کے زمانے میں ہوا جسے آج عالم عربی سے جانا جاتا ہے ــ تو دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض ممالک نے عربی زبان کے خلاف بغاوت کی۔ اور ان واقعات و حالات کی وجہ سے جن کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے، از سرنو اپنی مادری زبان کو سینے سے لگایا یہاں ان حالات کا تذکرہ کرنا ناممکن ہے جیسے شعوبیت وقومیت کی تحریک اور ملکی گروہی اور قومی عصبیات وغیرہ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے ان حالات کا سب سے زیادہ لحاظ کیا وہ مختلف ردعمل کے ضمن میں حسن نیت سے مزین تھے اور کچھ لوگوں نے تباہ کن، نفرت انگیز حالات وتصورات کی وجہ سے یہ کاروائی کی لیکن دونوں ہی چیزوں کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی قومیں اسلامی تہذیب کی ممتاز زبان عربی سے نکل گئیں گرچہ وہ اسلام سے علیحدہ نہ ہوئیں لیکن لغوی دوری کی وجہ سے اسلام کے فہم میں بہت سی پیچیدگیاں اور الخرافات رونما ہو گئے مثال کے طور پر ایمان اور اس کے

آس پاس کے ممالک کو لے لیجیے۔ ایک زمانے میں وہ عربیت کا اہم ترین مرکز تھا اور اس کے علماء و مفکرین اور ادباء نے عربی زبان میں فقہ، تاریخ، زبان، افسانہ، اور ادب کے مختلف میدانوں میں اہم ترین اسلامی افکار پیش کئے تھے، از سر نو اپنی فارسی زبان کی طرف پلٹنے لگا، جو اس وقت عالم نزع میں تھی۔ چنانچہ بعض ایرانی حکام اٹھے اور انھوں نے فارسی میں تحریر و تصنیف کی ہمت افزائی کی۔ ان میں سلطان محمود غزنوی بھی تھا جس نے فردوسی کو جو فارسی زبان کے ماہرین میں تھا ایسے ادبی قالب میں ایران کی تاریخ محفوظ کرنے کی دعوت دی جس سے فارسی زبان کا تحفظ ہو سکے۔ چنانچہ فردوسی نے شاہنامہ فارسی زبان میں عربی زبان کے نظام اوزان و قوافی میں لکھی[1] شاہ نامہ فارسی ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار سمجھا جاتا ہے اسی وقت سے ایرانی اپنے ادب سے محبت کرنے لگے۔ اور اپنی زبان میں مہارت پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس زبان کے سامنے ڈگبیں ڈال دیں اور وہ ان کے ذریعہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی جبکہ اس کے ساٹھ فیصد الفاظ عربی کے ہیں اسی وجہ سے عربی کے خلاف ایران کی بغاوت کسی حال میں بھی مسیحیت اور اس کی زبان کے خلاف اس کی بغاوت کے مشابہ نہیں ہے[2]۔ چنانچہ مسیحیت جس نے بلاد مشرق میں سریانی زبان جو آرامی کی ایک شاخ ہے

---

[1] شاہ نامہ کے اشعار کی تعداد ساٹھ ہزار اور اس کے کلمات ۴ لاکھ ہیں اس میں ابتدا ر تاریخ سے لے کر عربی فتوحات تک ایرانی بادشاہوں کے حالات و کوائف ہیں۔

[2] خبر رساں ایجنسیوں نے اطلاع دی ہے کہ ایرانی انقلاب نے اعلان کیا ہے کہ عربی کو پھر سے ملک کی سرکاری زبان بنا دی جائے اور تعلیمی نصابوں میں اسے جگہ دی جائے یہ ایک مثبت قدم ہے جس کی تائید، ہمت افزائی اور تعمیم ہونی چاہیے۔

میں اپنی دعوت کا کام کیا۔ ایران کو زیر کرنے میں ناکام رہی اس طرح اس کی سریانی زبان جس میں انجیلیں لکھی ہوئی ہیں فارسی پر حاوی ہونے یا اس پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہی۔[1]
اس سے پہلے رومی اپنی لاطینی زبان کو عام کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں یہاں تک کہ جب وہ مسیحیت کی مذہبی وسفارتی زبان بن گئی تو لاطینی زبان پھیلی لیکن بس وہ سرکاری زبان رہی پھر یوروپ کی مقامی زبانیں اس میں خلط ملط ہوگئیں اور معروف زبانیں مادری لاطینی زبان کی شاخوں کی طرح ظاہر ہوئیں[2]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عربی تنہا وہ زبان ہے جو ان قوموں کی زبان بن سکتی ہے جو اصلاً اسے نہ بولتی رہی ہوں اور عربی اسلامی تہذیب کی زبان رہی اور تہذیب کے تحفظ کے لئے اور اس مقصد کے لئے کہ اس کے فرزند اسلامی تہذیب کے تعطل و توقف کے مرحلے سے نکل کر عطا بخشش کے مرحلہ میں پہونچا سکیں وہ اصل اور خالص رہے گی۔[3]

---

[1] ایران کا اسلامی قومی انقلاب ببانگ دہل ۲۲ر ۲ر ۱۹۷۹ء کو وجود میں آیا

[2] اسکیت نے تاریخ تہذیب سے متعلق تمام یوروپین الفاظ کو چار سو اصل کلمات کے اندر محصور کر دیا ہے

[3] الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی کی کانفرنس منعقدہ مارچ ۱۹۷۹ء ریاض میں جب کہ میں تہذیب اسلامی کے ضوابط پر گفتگو کر رہا تھا آج تک اجتماعی اور بین الاقوامی، میرے سامنے صندوق التضامن الاسلامی کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری جناب کاری ڈارمی تشریف لائے یہ آفریقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غیر عربی اور عربی زبان کے سلسلے میں اپنے اس شک پر بحث کرنے لگے کہ عربی زبان کو تہذیب اسلامی کا ایک تہذیبی ضابطہ بنانے کی صورت میں اگر کوئی قوم عربی زبان کے سوا تمام ~~ضوابط تہذیب~~ کی مالک ہو جائے تو کیا اسلامی تہذیب عطا تخلیق اور ترقی کے مرحلہ میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) داخل ہو سکے گی ؟ تو میں نے کہا: بلاشبہ تہذیب اسلامی علا کے مرحلہ میں آجائے گی لیکن وہ علا غیر مکمل ہوگی اس میں تکمیل اسی وقت آئے گی جب وہ امت قرآن کی زبان میں مہارت پیدا کرے۔ عربی زبان تہذیبی ضوابط کا اہم ترین ضابطہ ہے جس طرح غیر عرب قوموں کو عربی سکھانا اسلامی فریضہ ہے اور اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے اس سے پہلے یہ قومیں عربی زبان بول چکی ہیں اور آج بھی ان کے امکان میں ہے۔ بلکہ آج تعلیم کے وسائل کی جو کثرت ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ تھی اس وجہ سے آج یہ زبان زیادہ آسان ہے۔ جس طرح آج بعض قومیں جن میں مسلمان بھی شامل ہیں انگریزی وغیرہ بولتی ہیں حالانکہ ان کی مقامی زبان کچھ اور ہے۔

اے قابل احترام بھائی عربی بغیر کسی زحمت و پریشانی کے بولی جا سکتی ہے۔ لیکن اسلام کے دشمن اور سازشی افراد مختلف وسائل سے عربیت کے نقوش کھرچ دینا چاہتے ہیں۔ اور قوموں کو اسے سیکھنے سے روکتے ہیں بلکہ خود عالم عرب میں عربی زبان کے خلاف ان کی سازشیں جاری ہیں کیونکہ عامی زبان بولنے کی کچھ لوگ دعوت دیتے ہیں اور دوسرے لوگ لاطینی حروف میں عربی لکھنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ ان تمام سازشوں کا ہدف ایک ہے کہ خود قرآن کی زبان جو اسلامی تہذیب کی زبان ہے مٹ جائے کیونکہ زبان سے قوموں کی نفسیات پر زبردست اثرات پڑتے ہیں۔

فصل ۳

اسلامی تہذیب میں توقف کی صورت

فصل ۳

اسلامی تہذیب میں توقف کی صورت

احمد گاش

توقف اور انحطاط کے درمیان

اسلامی تہذیب ناقابل تقسیم ہے

توقف تہذیب کا محافظ ہے

توقف ایک خاص حد میں

تہذیبی انفرادیت اور توازن کا عمل

پرفریب حملہ

کیا اسلامی تہذیب مرحلہ "عطا" سے قریب ہوئی ہے؟

تہذیبی ضوابط۔ جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس امر کی ضمانت فراہم کرتے ہیں کہ تہذیبی رفتار خط مستقیم پر قائم رہے گی یہ ضوابط تہذیب کی زندگی اور اس کی عطا، وبخشش کا تحفظ کرتے ہیں۔ اگر ضوابط ہر تہذیب کی نگاہ میں اہم ہیں تو اسلامی تہذیب میں ان کی قطعی بنیادی اہمیت حاصل ہے ان کا تعلق تہذیب اسلامی سے اسی طرح ہے جس طرح روح کا تعلق جسم سے ہے۔ بلکہ یہ ضوابط وہ واحد ماحول ہیں جن میں مفاہیم و تصورات کا عمل ہوتا ہے اور تہذیب اپنے جلوے دکھاتی ہے۔ اگر یہ ضوابط یا ان میں سے کسی ضابطہ کا تعطل کسی سبب سے عمل میں آجائے تو تہذیب اسلامی کی چولیں ہل جاتی ہیں پھر اس کا مکمل عطیہ رک جاتا ہے اور وہ انفرادی تہذیبی حالت میں پڑی رہ جاتی ہے یعنی عطا و بخشش کا سلسلہ رک جاتا ہے۔

توقف اور انحطاط کے درمیان

عطا، وبخشش سے یہ توقف انحطاط، انتشار یا زوال و غروب سے مختلف چیز ہے۔ توقف ایک ذاتی عمل ہے جسے تہذیب کسی ضابطہ یا تمام ضوابط کو معطل کر کے اپنے اوپر طاری کر لیتی ہے۔ تہذیب اپنے تصورات میں باقی رہتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات ان تصورات کے جزئی عمل میں تہذیب کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ضیا باری، اس کی تخلیق و تحقیق اور اس کی عطا، وبخشش رک جاتی ہے اس لئے کہ اسلامی تہذیب پیوند کاری کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ حصہ بخرہ کرنے، شرکت اور مشارکت یا آدھے حل کو ٹھکرا دیتی ہے اور اس کا یہ انکار اس کا وہ اہم اور نمایاں نقش ہے جو پوری گہرائی کے ساتھ اس کے اصول نیز مقابلہ و چیلنج کی صلاحیت رکھنے کا پتہ دیتا ہے۔ رہا انحطاط اور غروب تو اس کا مطلب تہذیب کا وجود سے زائل ہو جانا ہے اور ایسے ثقافتی ورثہ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے جو عام طور سے معمار کے فن کی نمائندگی کرتا اور علمی و فلسفیانہ کتابوں

میں محصور رہتا ہے۔ یعنی تہذیب مکمل پژمردگی کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ وہ عمل ہے جو مسلمان کو اس تہذیب کے کارناموں سے کاٹ دیتا ہے اور محسوس و مشاہد واقعہ کے ضمن میں ان مفاہیم و تصورات کے عمل پر تیشہ چلا دیتا ہے۔ چنانچہ جب تفاعل مضمحل ہو جاتا ہے اور اس کے اسباب و دلائل کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو تہذیب توقف نہیں بلکہ ضیاع کے مرحلے میں پہونچ جاتی ہے بلکہ اس تہذیب کا انسان، جو بنیادی عنصر ہے، اپنے معاشرہ کے ساتھ اپنے تصورات سے الگ ہو چکا ہوتا ہے اور ان سے بغاوت کر دیتا ہے پھر تو ناگزیر ہو جاتا ہے کہ تاریخ اور واقعات زمانہ کے ساتھ یہ تصورات مٹ جائیں اور ان میں تفاعل اور قوت حیات باقی نہ رہے۔

اسلامی تہذیب ناقابلِ تقسیم ہے

اسلامی تہذیب جو عطاء و بخشش سے ذاتی توقف کے مرحلہ میں ہے، زندگی کے ان بہت سے لوازمات کی اب بھی مالک ہے جو دوسری تہذیبوں کے یہاں موجود ہوتے تو وہ اپنے کو عطاء کے مرحلہ میں سمجھتیں۔ مسلمانوں کی اکثریت آج بھی عام اسلامی تصورات پر ایمان رکھتی ہے گرچہ یہ ایمان اختلاط و انحراف کا شکار ہو چکا ہے۔ بیشتر مسلمان اپنی زندگی کے مختلف معاملات میں اسلام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح اسلام کے بعض عام ادارے بعض مسلمان ملکوں میں قائم بھی ہیں (مثال کے طور پر بعض ممالک میں زندگی کے بعض پہلوؤں میں جیسے پرسنل لاء اور وقف میں علمی اسلامی شریعت کا نفاذ و تحقیقی ادارے، اسلامی تحریکات، مساجد اور حج کا قیام وغیرہ۔)

تاہم تقسیم کو ٹھکرا دینے والی اسلامی تہذیب اس بات کو لازم سمجھتی ہے کہ عطاء و بخشش

کے مرحلے میں داخل ہونے کے لئے اور توقف کے مرحلے سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام ضوابط پائے جائیں۔ وہ اسلامی معاشرے کے قیام میں آزاد ہو، عام زندگی کو اسلام کے چوکھٹے میں فٹ کر سکے اور تمام اداروں سے اپنے مفاہیم و تصورات کی پوری آزادی سے پابندی کرا سکے۔

توقف تہذیب کا محافظ ہے

اسلامی تہذیب عطا و بخشش سے توقف کو بڑی اہمیت دیتی ہے۔ توقف تہذیب کو ہر قسم کے کھوٹ اور ملاوٹ سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح مسلمان کو تہذیب کی عطا و بخشش کے لئے سراپا انتظار بنا دیتا ہے اور تہذیب کی رفتار کو از سر نو جاری کرنے کے لئے بہتر کوشش پر انہیں آمادہ کرتا ہے جبکہ انہیں اپنی کوتاہی اور گناہ کا احساس بھی رہتا ہے اور وہ تہذیب کے توقف کی ساری ذمہ داریاں اور اس کی رفتار رک جانے کا سارا بوجھ اس کے تمام ضوابط یا بعض ضوابط کی عدم موجودگی پر ڈالتے ہیں اس طرح وہ ایک طرف عطا و بخشش سے محروم ہوتے ہیں اور دوسری طرف سزا سے دوچار ہونے کے لئے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

اسلام عطا و بخشش سے توقف کو ایک سزا سمجھتا ہے جس کی یہ امت اس وجہ سے مستحق ہوئی ہے کہ بعض ضوابط یا تمام ضوابط معطل ہو گئے ہیں۔ اسلامی تصورات سے انحراف اور صحت مند علیت کا تعطل یہ دونوں عطا سے توقف کی سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات ناقابل قیاس ہے کہ انحراف کے ساتھ عطا کا فیضان ہو اسی طرح یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر عادلانہ سزا کے انحراف باقی رہے۔

توقف ایک خاص حد میں

تاہم اسلام جو اس انحراف کے مختلف اسباب کا ادراک کرتا ہے جن میں سے بعض امت کے

ارادہ واختیار سے خارج ہیں جن کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے، سزا میں سختی نہیں کرتا اور عطا و بخشش کو روکنے میں تشدد نہیں برتتا۔ اس کی تہذیب توقف اتنی ہی مقدار میں اختیار کرتی ہے جو اسے امر واقعہ سے غیر ذمہ دار قرار دیتی ہے اور جس کے ذریعہ وہ اپنی تازگی اور خیر کی محافظت کر سکتی ہے اور جس میں توقف کے اسباب معلوم کرنے اور ان کا حل دریافت کرنے کے لئے عوام کے لئے ردعمل کی گنجائش رہے۔ اس مقدار کی اسلامی تہذیب بڑی مہارت، احتیاط اور ہوشیاری سے ترمیم کرتی ہے وہ ایک طرف کامل عطاء کا انکار کرتی ہے اور دوسری طرف توقف کو انتشار وانحطاط میں تبدیل ہونے سے بچاتی ہے۔

عطاء وانحطاط کے درمیان اس ماہرانہ توازن کے ذریعہ ہی تہذیب اسلامی دوسری تمام تہذیبوں سے ممتاز ہے اور اس کی یہ حیرت انگیز خاصیت اس کی قدرت وصلاحیت اور انفرادیت وامتیاز اور اصلیت کا پتہ دیتی ہے۔

تہذیبی انفرادیت اور توازن کا عمل

توازن کا یہ عمل توقف کے سنجیدہ وپیچیدہ مسائل میں بہت اہم ہے اور لچکدار اور متحرک شکل میں اس کے تسلسل ہی کے ذریعہ مطلوب توازن اور تفاعل کا حصول ہوتا ہے۔

اور تہذیبی انفرادیت کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ قومی تہذیبی ادارے ہیں جو کامل عطاء کے مرحلے میں تھے پھر توقف کے مرحلے میں پڑے رہ گئے جیسے شرعی عدالتیں، اوقاف، مساجد تعلیمی اور فقہی ادارے، حج، زکوٰۃ، حکام الاخلاق، علماء ومفکرین کی تحریکیں یا پھر وہ ادارے ہیں جنہیں اسلامی تصورات اور زمانے کے ارتقاء کی منطق میں وجود میں لانا ممکن ہے جیسے منظم اجتماعی تحریکیں (سیاسی پارٹیاں) یا عالمی کانفرنسیں اور اعلانیہ یہ ادارے جو متحرک عطاء وبخشش کا اسلوب اختیار

کرتے ہیں۔ اس کے ذریعہ اسلامی تہذیب کے وجود کی محافظت کرتے ہیں اور ایسے عناصر بن گئے ہیں جو تہذیب کو توقف سے عطاء کے مرحلے میں لے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسجد جو عوامی اجتماعیت کا مرکز ہے جیسے پنج وقتہ نمازوں کا امام اپنی نماز میں اور کم از کم ہفتہ وار خطبہ میں اور دوسری توجیہات وارشادات میں قابو میں کرتا اور اس کی قیادت کرتا ہے۔ یہ وہ متحرک تہذیبی ادارہ ہے جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

ج ۔ عظیم قومی کانفرنس ۔ جو ایک وقت میں واضح عباداتی اعمال میں متحرک ہے جو انسانوں کو ایک جگہ اور ایک ہی خطاب میں جمع کر دیتا ہے یہ وہ بلند تہذیبی صورت ہے جو اسلامی تہذیب کو غذا فراہم کرتا ہے اور اسے دوسری قومی انفرادیت سے نوازتا ہے اور ہر قسم کے انحطاط وزوال سے اس کا تحفظ کرتا ہے۔ اور علمی ادارے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسے طبقوں اور گروہوں کی تخریج کا کام کرتے ہیں جن سے وہ صحت مند قیادت نمایاں ہوتی ہے جو مسلمانوں کے مختلف علاقوں میں از سر نو اسلامی زندگی کے آغاز کے لئے مسلم جماعتوں کے قیام واہتمام اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔

علماء ومفکرین اور پریس سے شائع ہونے والی ہزاروں کتابیں چاہے وہ ورثہ سے متعلق ہوں یا مجددین کی کتابیں ہوں، اسلامی اخبارات ورسائل سے قطع نظر یہ تمام چیزیں نمایاں تہذیبی مظاہر ہیں از سر نو اسلامی زندگی کے قیام اور حالیہ اسلامی رفتار کی تصحیح واصلاح کے مقصد سے مزین منظم اسلامی تحریکیں جو جمع کرنے والی قومی تحریکیں ہیں اور تہذیبی ذمہ داریوں کا شعور رکھتی ہیں، بجا طور پر آج کی دنیا میں یا تہذیبی توقف کے مرحلہ میں اہم تہذیبی مظاہر سمجھی جاتی ہیں۔

وہابی تحریک جس کی قیادت محمد بن عبد الوہابؒ نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں کی پر زور گیب کے اقوال عالم اسلام کے انحطاط کے خلاف گونج دار آواز تھی۔

اخوان المسلمون اور پاکستان، ایران اور ترکی کی اسلامی جماعتیں پھر یورپ و امریکہ کے مسلم طلبہ کی انجمنیں اور قومی و سرکاری اسلامی کانفرنسیں، سب نمایاں تہذیبی مظاہر ہیں۔ از سر نو اسلامی زندگی کے قیام کے لئے ان کی حیثیت اس زنجیر کی ہے جس کے حلقے آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

شریعت اسلامی کے نفاذ کوشش۔ بعض عرب اور مسلم ممالک میں ان کی جزئی تنفیذ سے قطع نظر اور شریعت کو قانون کا سرچشمہ بنانے اور مملکت کا مذہب اسلام کو بنانے پر جو اصرار پایا جاتا ہے اس سے بھی قطع نظر۔ بلند تہذیبی مظاہر ہیں۔

یہ اور ان کے علاوہ دوسرے تمام مظاہر اسلامی تہذیب کے اخراج کردہ ہیں اور یہ تہذیب عطا سے توقف کے مرحلہ میں بھی ایسی محفوظ دیوار کی تشکیل کر رہی ہے جو اسے بعض غلطیوں سے محفوظ رکھ رہی ہے اور گرچہ وہ تہذیب توقف کے مرحلہ میں ہے تاہم اس پر جدید تخلیقی ذاتیت کی تحریک کی چھاپ قائم کر رہی ہے، یہ وہ تحریک ہے جو تہذیب اسلامی اور اس کے تہذیبی ضوابط پر حملہ آور تمام مراکز کے خلاف لوہے کا چنا ثابت ہو رہی ہے جس نے تہذیب کو توقف کی سخت و شدید حالت میں تبدیل کر دیا ہے جسے کوئی نرم نہیں کر سکتا۔

پُر فریب حملہ

یہ پر فریب حملہ جسے دنیا کی تہذیبوں نے اور خاص طور سے مغربی تہذیب نے اپنا شعار بنایا ہے، مختلف میدانوں میں بڑی تندی و سختی سے ناوک افگنی کر رہا ہے اور اسے بہت سے تحفظات حاصل ہیں۔ تاریخ اسلامی کے آغاز سے ہی اس حملہ کا آغاز ہوا ہے چنانچہ اسلام کے فکری و عقائدی رجحانات میں یہودی، مسیحی، ہندی، فارسی، رومی اور یونانی اثراندازی کی کوششیں موجود رہی ہیں۔ پھر مسلم ممالک پر صلیب کے سخت و شدید حملے ہوئے جن کے بعد تاتاریوں اور مغلوں کی یورش

عمل میں آئی۔

گرچہ اس کے بعد قسطنطنیہ فتح ہوا لیکن اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے چلا گیا اور ان ممالک میں اسلامی تہذیب مٹ گئی پھر پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی اور اس کے نتیجے میں بہت سے اسلامی ممالک کالونیوں میں تبدیل ہو گئے اور ترکی اسلام سے بغاوت کر گیا اور اسلامی قوانین کا اس نے استیصال کر ڈالا، عربی حروف کو اپنی زبان سے کھرچ کر پھینک دیا اور مسلمانوں کے ممالک میں قومی نعرے بلند ہوئے تمام عرب اور اسلامی ممالک میں ایسے تہذیبی، تعزیری، تجارتی اور ملکی قوانین کے مجموعے نافذ ہوئے جن میں بیشتر مغربی ممالک کے قوانین سے ماخوذ تھے پھر استعمار کے خلاف آزادی کی لہر چلی اور بہت سے ممالک آزاد ہو گئے جبکہ بہت سے ممالک مشرقی یا روسی حکومت کے باج گزار ہو گئے اور آزاد ممالک ان رجحانات کی شکار گاہ بن گئے جو بنیادی طور سے مغربی یا مشرقی تہذیب کے تصورات سے ابھرے تھے۔ انہی حالات میں عالمی صہیونیت کی ترکتازیوں اور بین الاقوامی سازشوں کے نتیجے میں فلسطین چلا گیا اور اس زبردست المیہ پر امت آہ و بکا کرتی رہی۔

ان بدترین اور نفرت انگیز فوجی حملوں کے ساتھ جو صدیوں تک جاری رہے اسلامی افکار و تصورات کے خلاف سازش کا جال لیکر "تہذیبی حملہ" نمودار ہوا۔ ہم یہاں اس پر فریب حملہ کے چند مراکز کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ مسیحیت اور استشراق کا مرکز

۲۔ پارٹیوں اور یونینوں کا مرکز

۳۔ جدید فکری رجحانات کا مرکز

۴۔ اسلامی رجحان کے خلاف جنگ کرنے اور تشکیک والحاد پھیلانے کا مرکز[1]

۵۔ زندگی اور زبان میں مکمل تہذیبی اجنبیت کی طرف دعوت دینے کا مرکز

کیا اسلامی تہذیب عطا کے مرحلہ سے قریب ہوئی؟

اس حملہ کی مکاری اور پُرفریبی نے بہت سی تہذیبوں کے نقوش ختم کر دیئے ہیں اور داستان کہنہ اور ماضی کے دلچسپ افسانے بنا دیئے ہیں لیکن اسلامی تہذیب کے پاس چونکہ محافظ ادارے ہیں اور اس کی ربانی و دائمی کتاب قرآن میں چھپی ہوئی اہم ذاتی صلاحیت موجود ہے اس لئے عطاء سے توقف اور اپنے میں سمٹنے سکڑنے کے باوجود وہ خطرناک گھاٹیوں کو پار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو مکمل عطاء و بخشش کے مرحلہ میں داخلہ کے لئے تمہید ہیں۔

عالم اسلام میں اس وقت جو چھلانگیں لگائی جا رہی ہیں اور دوسرے علاقوں میں پس پردہ جو کام ہو رہے ہیں وہ واضح طور پر اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ توقف کا مرحلہ اب ختم ہوا چاہتا ہے اور تہذیب اسلامی از سر نو اپنی تابناک ضیاباری کے لئے تیار ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خروج کا یہ مرحلہ آسان اور سہل ہے، بلاشبہ مختلف تہذیبوں میں دلچسپی رکھنے والے افراد اور پوری دنیا میں سازشوں کا جال بچھانے والے دشمن اپنی صفوں میں از سر نو تنظیم پیدا کر رہے ہیں۔ اور اسلامی تہذیب کے ہاتھ میں عالمی قیادت کی باگ ڈور کو جانے سے روکنے کے لئے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم اس چیز پر

---

[1] ہماری کتاب الطریق الی الحکم اسلامی کی فصل الہجوم الماکر کو تفصیل کے طالبیں دیکھیں۔

ایک اشارہ کرنا چاہیئے کہ مجلہ "جوئش کرانیکل" نے مغربی دنیا اور سویت یونین چہ دونوں کو ایک ساتھ وارننگ دی ہے کہ وہ ان خطرناک اثرات اور خوفناک حالات پر نظر رکھیں جو ممکن ہے مسلمانوں کے جذبہ جہاد پر مرتب ہوں جو بیسوی صدی کے آخری دہائی میں رونما ہوئے ہیں۔ اس مجلہ نے واضح کیا ہے کہ مغربی سیاست کی حکمت عملی مرتب کرنے والے حضرات کو سخت رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اگر انہوں نے ان بڑھتی ہوتی تحریکوں سے نظریں چرائیں جو عالم اسلامی کے اداروں اور یونیورسٹیوں کو جدید زندگی کے فوائد اور بنیادی تعلیمات کی طرف واپسی پر نظر ثانی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس نے زور دے کر کہا ہے کہ

"نہ تو غربی دنیا نہ سویت یونین اس پوزیشن میں ہے کہ عالم اسلامی کی بیداری کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکے۔"

فصل ۴

اسلامی تہذیب کا چیلنج

فصل ۱۰

اسلامی تہذیب کا چیلنج

کامل شریعت حقوق

حلال و حرام کا ضابطہ یا تہذیبی نقش

نفاذ کی ذمہ داری اور ارتقا و ترمیم کا عمل

مقاصد اور وسائل

تہذیبوں سے گفتگو اور ثابت حقائق

انسان کا مکمل احاطہ

انسان کے لئے معتدل مناہج

حکمت متاع گم شدہ ہے

دوسروں کو تہذیب کی تشکیل کا موقع دینا

آج کی مغربی تہذیب

کارلائل۔ "مجہول انسان"

لی بان کے خیالات

روجیہ غارودی کے نظریات

کانسٹانتیان جارج کا خیال

مصنوعی تہذیبیں

عصا اور وجود ضوابط کا رشتہ

میں مسلمان ہوں اس لئے مہذب ہوں

تہذیب ــــ جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں ــــ ایک طرف انسان اور اس کے معاشرے کے درمیان اور دوسری طرف ماحول اور ان دونوں پر محیط موجودات کے درمیان تفاعل کا نام ہے اور اسلامی تہذیب ــــ جیسا کہ ہم اسے بھی پڑھ چکے ہیں ــــ اسلامی تصورات کے عمل کرنے کا نام ہے جو اس روئے زمین پر خدا کی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں تہذیب کا یہ وسیع وعریض مفہوم، اور خاص طور سے تہذیب اسلامی کا یہ مفہوم اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ اسلام کی تہذیب زندگی کے تمام گوشوں کو محیط اپنے فکر و تصور کے ضمن میں مقابلہ کی حیثیت رکھتی ہے چاہے تہذیب عطا و بخشش کے مرحلے میں ہو یا توقف کے مرحلے میں اور خواہ وہ پھیل رہی ہو یا سمٹ سکڑ رہی ہو اور خواہ یہ گوشے اس کے خاص تہذیبی مجموعہ سے اور اس کے تفاعل کے تسلسل سے متعلق ہوں یا ایک تہذیب کی حیثیت میں ان کا تعلق دوسری تہذیبوں سے ہو ان تمام مقابلوں کے روبرو اسلامی تہذیب پوری تیاری اور ایسے ثابت تصورات کے ساتھ چلتی ہے جو کشمکش کے عمل کو ایسے چیلنج اور مبارزت میں تبدیل کر دیتے ہیں جن کا لہجہ کبھی سخت و درشت ہوتا ہے اور کبھی نرم اور لچکدار۔

ان للکاروں کی زندگی اور تحریک سے ہی اسلامی تہذیب کشمکش کے سامنے اور بالآخر اس کے احاطہ و گرفت میں ثابت قدم رہتی ہے۔ تہذیب اسلامی کی دوسری خصوصیات کی طرح اس کی یہ للکاریں بھی اس کی اصل ذاتیت سے ابھرتی ہیں اور ان کا مقصد تہذیب اسلامی کے وجود اور استحکام کی تحصیل ہے۔

تہذیب اسلامی کے سیاق میں ہم سات بنیادی للکاروں کا وجود پاتے ہیں:

کامل شریعت حقوق

تہذیب اسلامی کی پہلی للکار وہ مکمل شریعت ہے جو انسان، اس کی اجتماعیتوں، اس کی ریاستوں، اور ارد گرد کی کائنات حیوانات، نباتات، جمادات اور موجودات سے اس کے تعلقات پر محیط ہے۔

یہ شریعت انسانی زندگی میں اپنی نوع کی پہلی شریعت۔ اپنی کاملیت و جامعیت میں اس کا کوئی نظیر نہیں، وضاحت و عدالت میں یہ بے مثل ہے اور ہر زبان و مکان میں سہارا دینے کی اس کی صلاحیت و قدرت صرف اس کے لئے مخصوص ہے۔ یہ شریعت پورے وجود کے اساسی تصورات کی نمائندگی کرتی ہے۔

یہ شریعت پورے انسان کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ اس کے وجود کی تنظیم کرتی ہے اور نصب العین کا تعین کرتی ہے۔ اس کے تعلقات جو اپنے آپ سے، اپنے رب سے اور اپنے ہم نفسوں سے ہونے چاہئیں، ان کو درست کرتی ہے۔ اور اس کی آزادیوں کا تحفظ کرتی اور اس کے اجتماعی، اقتصادی، سیاسی اور ریاستی معاملات کی نگہداشت کرتی ہے۔ س شریعت میں حیوان کے حقوق، ان کی قدر و قیمت کی تعیین اور انسانوں سے ان کے تعلق کی نوعیت بھی موجود ہے۔ یہی حال نباتات اور جمادات کے ساتھ بھی ہے۔ نباتات کے کچھ حقوق ہیں جنھیں پامال نہیں ہونے دینا چاہیئے اور انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان سے معاملہ کرتے وقت ان حقوق کی نگہداشت کرے اور کائنات، اس کی فضا اور ان میں موجود وسائل اور معدنیات کے بھی حقوق ہیں جنھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

اگر اسلام انسان، حیوان، نباتات اور تمام موجودات کے لیئے جامع تہذیبی

شریعت کا تشکیل کرتا ہے اور ان مخلوقات کے درمیان تفاعل کے طریقوں اور تعلقات کے مزاج اور ان حدود کی تنظیم کرتا ہے جہاں ٹھہر جانا ضروری ہے۔ تاکہ ظلم وعدوان تک معاملہ نہ پہونچ جانے تو واضح شریعت کا حامل ہونے کی وجہ سے اس نے تہذیبی عناصر کو بہت کچھ تفوق، برتری، نافعیت اور اکملیت بھی عطا کی ہے اور اس کے لئے ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر تہذیبی تفاعل کے اصول وضوابط بھی مرتسم کئے ہیں۔

مغربی مسیحی تہذیب اور اس کے شکم سے جنم لینے والی اشتراکی تہذیب سمیت تمام نئی اور پرانی تہذیبوں کا مطالعہ کیجئے اور انسانی حقوق کا قانون، حیوانات کے ساتھ نرمی کرنے کی انجمنوں کے دساتیر اور نباتات اور فضا سے متعلق اکیڈمیوں کے نتائج دیکھئے تو ایک واضح حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اسلامی تہذیب ہر میدان میں آگے ہے اور تمام تہذیبوں سے بہت بلند اور ممتاز ہے یہاں تک کہ بہت سی خصوصیات اور کارناموں میں اسے تفوق حاصل ہے۔

حلال وحرام کا ضابطہ یا تہذیبی نقش

شریعت حقوق کی اس للکار کی رو سے اسلامی تہذیب زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنا امتیازی نقش قائم کرنے کی خواہش مند ہے، تاکہ خود زندگی اور اس کے متعدد اعمال کے درمیان اسے دیکھا جا سکے، شاید حلال وحرام کا ضابطہ ہی وہ تہذیبی نقش ہے جو اسلامی تہذیب انسانوں کے حقوق اور ان کے ماحول، موجودات، نباتات اور حیوانات کے درمیان تعلقات اور تفاعل کی عالمی شریعت کے تمام اقوال واعمال میں قائم کرتی ہے۔

یہاں تک کہ یہ ضابطہ اور فلسفہ وہ حساس میزان بن جاتا ہے جسے بے ساختگی اور راست بازی کے ساتھ ہر چھوٹا بڑا، مطیع ومطاع فرد لئے رہتا ہے۔

حلال و حرام کا فلسفہ تہذیب اسلامی کے اہم اور نمایاں نقوش میں سے ہے بلکہ یہ اس کے اسرار میں شامل ہے۔ یہ قطع نظر اس سے کہ وہ میزان ہے جس پر آدمی اپنے اعمال کو تولتا اور اس کی بنیاد پر انھیں درست رکھتا ہے، وہ اہم محافظ آلہ ہے جسے اسلام ہر فرد کو معاشرے کے اعمال افعال اور سرگرمیوں پر مکمل مراقبہ و محاسبہ کی صلاحیتیں دے کر اس کی قوت حافظہ میں قائم کر دیتا ہے اس عملی تصور کے واسطہ سے قوانین و شرائع اور حقوق و تنظیمات کو ذاتی مراقبہ کی خصوصیات مل جاتی ہیں اور ہر فرد شعوری و غیر شعوری طور پر یکساں ان قوانین کا نگراں ہو جاتا ہے، وہ اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ وہ اس کا اپنا قانون ہے اور اس کا نفاذ کھلے چھپے ہر حال میں مطلوب ہے، اور آخرت میں اس کا حساب کتاب ہوگا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ ہے۔ اگر اس نے مخالفت کی اور معصیت کا ارتکاب کیا اور دنیا میں اقتدار و حکومت کی نگاہوں سے اس کے جرائم چھپے رہے تو وہ آخرت میں اس وقت سامنے آجائیں گے جب اس کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں اور کان اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

اس طرح حلال و حرام کی بنیاد پر قائم قوانین و شرائع صحیح ڈھنگ سے نافذ ہوتے ہیں چاہے انسان تنہا ہو اور لوگوں کی نظروں سے دور ہو۔

مندرجہ ذیل چند مثالیں ہمیں ان تصورات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ان کے تفاعلی اثرات کی ایک جھلک دکھاتی ہیں۔ چنانچہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تاکید کرتے ہیں کہ پڑوسی کے کچھ حقوق ہیں اور ایک حق یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں عمارت زیادہ اونچی نہ بنوائی جائے کہ اس کے یہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہ ہو سکے تو آپ اس کے ذریعہ بیک وقت عمرانیاتی اور اجتماعی دونوں بنیادوں کی ترسیم کرتے نظر آتے ہیں اور دونوں پر حلال و حرام کی چھاپ پڑتی ہے۔

جب مملکت کی تنظیم آبادی کے نقوش اور سڑکوں اور شہروں کی منصوبہ بندی کی ترسیم کرے

گی تو اس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ تعمیراتی انجینیرنگ کے اسلامی فن کے اشاروں اور عمرانیاتی تصور کو سامنے رکھے یہاں تک کہ اگر اقتدار کی طرف سے صادر ہونے والے سرکاری قوانین میں یہ چیز مفقود ہو تو افراد از خود ان تصورات کو نافذ کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا تعلق حلال و حرام کے تصور اور اساسی اصولوں سے ہے اور ان کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

مالیات میں متعدد مشکلات و مسائل خلط ملط ہو جاتے ہیں اور آپس میں بڑا التباس ہو جاتا ہے تاہم حلال و حرام کے حقائق سب پر حاوی رہتے ہیں مثال کے طور پر سودی کاروبار، جو قدیم و جدید ہر دور میں معروف رہا ہے آج اس نے متعدد صورتیں اور شکلیں اختیار کر لی ہیں لیکن حلال و حرام کے مفہوم کے ضمن میں اللہ نے سود کو حرام کیا ہے اور بیع کو حلال کیا ہے۔ اگر مملکت مالی ڈھانچے کی تنظیم نہ کرے تو افراد از خود ان کی تنظیم کرتے ہیں۔ اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دیتے ہیں۔

لباسوں میں اسلام اپنے تصورات کا رنگ غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان میں کچھ حدود اور شرائط کی تعیین کرتا ہے اور انھیں حلال و حرام کے تقاضوں سے مربوط کر دیتا ہے اور جائز و ناجائز اصولوں سے جوڑ دیتا ہے۔ اس طرح لباس وہ تہذیبی مظہر بن جاتا ہے جو ان معیارات سے مربوط ہے جن کا ہر وہ فرد مالک ہے جو ان کی افضلیت کا شعور رکھتا اور ان کی ناگزیریت کا احاطہ کرتا ہے۔ اب اگر سرکاری قوانین موجود نہ ہوں تو لوگ برضا و رغبت لباس کے معاملہ میں ان اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔

اسی طرح ——————— بچوں اور نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت، زندگی کے آداب اور مختلف اجتماعی تعلقات میں ہم حلال و حرام کا ظاہرہ موجود پاتے ہیں جو دوسرے تصورات کے ساتھ تصادم کی حالت میں مشکلات کے درمیان اپنی راہ نکال لیتا ہے۔ تاکہ اس تصادم کے ذریعہ بلند اصولوں سے تعلق اور ان کے استحکام و ترسیخ پر زور دے سکے۔

یہاں تک کہ حیوانات کے ساتھ نرمی کرنے کا اصول بھی اسلام میں حلال وحرام کے فلسفہ سے مربوط ہے چنانچہ اس میں کوتاہی گناہ کے اس درجہ تک انسان کو پہنچا دیتی ہے کہ آخرت میں اسے سزا ملتی ہے یا اس کی پابندی سے انسان کی ایسی ترقی ہوتی ہے کہ وہ جنت کی نعمتوں میں جا داخل ہوتا ہے ۔ اس عورت کی مثال ہمارے سامنے ہے جو جہنم میں اس بلی کی وجہ سے داخل ہوئی جسے اس نے قید کر رکھا تھا نہ اسے کھلاتی تھی نہ چھوڑتی تھی کہ زمین کے کیڑوں مکوڑوں کو کھا کر پیٹ بھرے اور اس آدمی کی بھی مثال ہمارے سامنے ہے جو جنت میں داخل اس کتے کی وجہ سے ہوا تھا جسے اس نے اپنے جوتے کے سہارے سے پانی پلا دیا تھا جب اس نے اسے ایک کنویں کے قریب زبان چاٹتے دیکھا تھا۔ یہ دونوں مثالیں حیوانات سے انسان کے تعلقات پر وہ بنیادی نقوش قائم کرتی نظر آتی ہیں جن کی نظیر دنیا کی کوئی تہذیب پیش نہیں کر سکتی۔

اسی طرح اسلام مثال کے طور پر جب اپنے نظام حرب میں درختوں کو کاٹنے اور کھیتوں کو تباہ کرنے سے روکتا ہے تو وہ اس کے ذریعہ تعلقات کے مزاج میں چند اساسی اصولوں کی ترسیم کرتا ہے جن کا آدمی کو میدان جنگ میں بھی لحاظ رکھنا ہے اور دل کی گہرائیوں سے حلال وحرام کے مفہوم کو پورا کرنا ہے۔

نفاذ کی ذمہ داری اور ترمیم وارتقاء کا عمل

جیلنج کے اس تصور کے نتیجہ میں جو زبان ومکان پر دراز ہے خواہ حالات ومسائل کچھ ہوں۔ اسلامی تہذیب بیک وقت فرد اور جماعت دونوں کی جس میں دونوں کی ذمہ داری پیوست کر دیتی ہے یعنی اسلامی تہذیب کے مفاہیم وتصورات کی تنفیذ (اسے ہم نے حلال وحرام کے عمل کے ضمن میں دکھایا ہے) اور ترمیم وارتقاء کا عمل (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور فساد کے خاتمہ

ظلم کے ازالہ اور اسلامی حکومت کے قیام کا کام) دونوں ہی کی ذمہ داری ہے۔

چنانچہ جب اسلام ترمیم وارتقاء کے عمل کو حکومت اسلامی کی اقامت اور جہاد کی ترویج کو ہر فرد مسلم پر متعین دوسرے فرائض کی طرح ایک فرض قرار دیتا ہے ــــــ گرچہ ان فرائض کے درجات مختلف حالات وضروریات میں مختلف ہیں لیکن وہ سب بہر حال فرائض ہیں ــــ جنھیں چھوڑنے سے اور انجام نہ دینے سے مسلمان گناہ گار ہوتے ہیں۔ تو اس کا مقصد اس کی تہذیب پرنت نئی زندگی کو باقی رکھنا ہوتا ہے خواہ وہ عطار سے توقف کے مرحلہ میں ہو۔

اسی وجہ سے ہم نے کہا تھا کہ توقف کے مرحلہ میں بھی اسلامی تہذیب ایک دوسری عطار کی حالت میں ہوتی ہے وہ یہ کہ عوامی ذاتی لوازمات وخصوصیات کی مالک ہونے کی وجہ سے خود اپنی حفاظت، عدم انحطاط یا عدم انتشار کی ضمانت رکھتی ہے۔ اسی طرح تغیر وترمیم کی کارروائیوں میں جماعتی پیمانے پر ان صلاحیتوں کے حصول کی وجہ سے جن سے اسلامی تہذیب تمام رکاوٹوں پر غلبہ پانے کے لئے اور وسیع تر رفتار اور تفاعل کا آغاز کرنے کے لئے مسلح ہے شمولیت کی وجہ سے وہ بنیادی عطار وبخشش کو از سر نو شروع کرنے کی خصوصیات رکھتی ہے۔

مقاصد اور وسائل

وہ بنیادی نکات جن سے اسلامی تہذیب دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مکمل طور سے ممتاز ہو جاتی ہے اور جن کی وجہ سے اہم تہذیبی للکار کے مقام پر آجاتی ہے ان میں سے ایک بنیادی نکتہ مقاصد ووسائل کے دائروں کی تعیین اور فکر وتصور کے مکمل محتاط اور شاندار وضاحت کے ساتھ ان دونوں کے درمیان تمیز وانتخاب ہے کہ مبادا وسائل مقاصد کا درجہ لے لیں اور انسان اپنے بلند تہذیبی مرکز سے نیچے گر جائے یعنی روئے زمین پر خدا کی خلافت سے دستبردار ہو جائے۔

جب اس روئے زمین پر انسانی وجود کا مقصد انسان کے تمام ظواہر میں خلافت کی تحصیل ہے اور اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اس مقصد کی خاطر وہ زمین کی تمام مسخر طاقتوں کو استعمال کر سکے تو یہ انسان بہت بڑا ظلم کرے گا اگر وسیلہ کو جو اس کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اپنا مقصد بنا لے جیسے بُت ہے جس کے ارد گرد وہ گھومتا ہے چاہے یہ بت پتھر ہو جیسا کہ قدیم زمانے میں ہوتا تھا یا یہ بت مشین ہو جیسا کہ دور جدید میں ہوتا ہے۔ وسیلہ کو مقصد کا مقام دینا درست نہیں ہے ورنہ معاملات خلط ملط ہو جائیں گے اور معیارات معطل ہو جائیں گے۔

اس مفہوم کو تہذیب اسلامی کے فرزندوں کے ذہن میں پوری وضاحت و تاکید سے بٹھانے کے لیے تاکہ یہ معنی ان کے یہاں بدیہی حقائق میں شمار ہو جائے اور بیک نظر ذہنوں میں سما جائے۔ اسلام نے مقاصد اور وسائل کے مفہوم کی تعیین کر دی ہے خدائے ذوالجلال کے اعجاز کے ساتھ انھیں مربوط کر دیا ہے فرماتا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ (انعام ۱۶۲)

(کہو میری نماز میرے تمام مراسم عبودیت جبکہ جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے)۔

مثال کے طور پر صفائی ایک وسیلہ ہے مقصد نہیں، آدمی نماز کے لیے صفائی اور پاکی حاصل کرتا ہے اور نماز رب العالمین کے لیے ہوتی ہے اور جنس کا عمل اگرچہ انسانی کی جسمانی ضرورت کی تکمیل کے لیئے وجود میں آتا ہے لیکن وہ لذت و تفاعل کے حصول کے باوجود وسیلہ ہے۔ جسے مقصد کا درجہ دینا صحیح نہیں ہے جنس کے وسیلہ کو اس کا مقصد مہذب بناتا ہے اور اسے زندگی را پر رہتی ہے اور اس میں جدت برقرار رہتی ہے

ہمارے وسائل ان کے مقاصد ہیں

لیکن مغربی تہذیب کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہاں صفائی بذات خود مقصد ہے۔

یہی حال جنس کا بھی ہے ان کے لیے فرد وہ وسیلہ اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنے لئے مفید تصور کرتا ہے چنانچہ ان کے یہاں نظافت بہت پیچھے رہ گئی اور جنس حیوانیت میں تبدیل ہو گئی یہاں تک کہ پورے زور اور تاکید کے ساتھ یہ کہنا ہمارے لئے ممکن ہو گیا کہ تہذیب اسلامی کے وسائل ہی تہذیب مغرب کے مقاصد ہیں اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کیونکہ "اسلام کے نصب العین نے اس کو ایک ایسی مخصوص تہذیب بنا دیا ہے جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے اور جس کا اعتقادی و عملی نظام دوسرے نظامات سے اساسی اختلافات رکھتا ہے"[۱]۔

اس لئے "تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔ لہذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا اور مافیہا سے جو معاملہ برتتا ہے اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ بھی بنیادی طور پر اس معاملہ اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے۔ ذہن کے بہت سے افکار و تصورات نفس کے بہت سے میلانات و رجحانات اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمۂ تہذیب ہے مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے"[۲]!

---

[۱] اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۹۹

[۲] سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۰۳

فنونِ لطیفہ

"مثال کے طور پر فنون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں جان تہذیب ہیں اور ان فنون میں اعلیٰ مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام بعض کو مکروہ اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوق لطیف کی پرورش اور جمال معنوی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے، اس کی رضاجوئی کے لیے عمل کر سکے اور اپنے منصب خلافت کے فرائض بجالا سکے۔"[۵]

اگر ہم نے فن اسلامی کی مثالیں بیان کی ہیں اب اس دھندلے تصور کی مزید وضاحت ہم یوں کر رہے ہیں کہ حلال و حرام اور مقصد و وسیلہ کے دونوں مفہوموں سے اسلامی فن کا ایک امتیازی اسلامی تصور ابھر کر سامنے آتا ہے کیونکہ یہ فن ـــــ جیسا کہ استاذ برنارڈ لوئیس کہتا ہے ـــــ اتنا واضح ہے کہ کسی بھی انسان کے لیے اس کا پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ "گرچہ اس کی فنی و تعمیراتی ثقافت محدود ہو وہ اس پوزیشن میں ہے کہ وہ عمارتوں کی تصویر میں یا ان کے لوازمات کے مجموعہ کو دیکھ کر ان میں سے اسلامی فن کو چھانٹ سکتا ہے، چنانچہ پل، مسجدوں کے منارے، عربی تعمیرات اور نقوش اور اشعار کے دروبست اور کھانا پکانے کا فن یہ سب مختلف میدانوں میں ہونے کے باوجود رسوم، اخلاق اور سلوک کی وحدت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ اسلامی وحدت ہے جو بنیادی طور پر شرق اوسط میں عربی، فارسی

۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۳۰۔

اور ترکی نمونوں پر موسیقی، تعمیرات، مناروں اور کنگروں میں تشکیل پائی ہے اور یہ وحدت اسلامی تہذیب کی شاخوں میں بھی دیکھی جا سکتی، سنی جا سکتی اور چکھی جا سکتی ہے اور یہ وحدت ہر جگہ موجود ہے۔ گرچہ عام آدمی کے لیئے قوانین، حکومتوں اور اداروں جیسے موضوعات میں اور سیاسی و اجتماعی افکار اور مواقف میں اس کی تلاش اور تعیین مشکل ہے۔[1]"

زیادہ وضاحت سے روجیہ غارودی کہتا ہے "مسجد سب سے بڑی رمزیاتی مثال ہے اور یہ تمام اسلامی فنون کی جامع ہے اور کہنے والوں نے صحیح کہا ہے کہ تمام اسلامی فنون مسجد کی طرح مارچ کرتے ہیں اور مسجد نماز کی طرف لے جاتی ہے۔[2]"

تہذیبوں سے گفتگو اور ثابت حقائق

اسلامی تہذیب تصورات، اقدار، تفاعل اور وجود کی مالک ہونے کی وجہ سے تہذیبوں سے گفتگو کو قبول کرتی ہے اور ان سے ٹھوس حقائق اور پیمانوں کے ذریعہ بات کرتی ہے اور حق کے اعتراف تک پہونچانے کے لئے اچھے انداز میں بحث کرنے کے لیئے تیار رہتی ہے۔

گفتگو کے جوہری نکات اسلامی تہذیب کے خیال اور فکر کے مطابق یہ ہیں:

(الف) انسان کا مکمل احاطہ

عالمی تہذیب وہ ہے جو انسان کا اس کے اول وجود سے احاطہ کر سکے اور ٹھوس بنیادی اصولوں

---

[1] برنارڈ لویس، الغرب والشرق الاوسط ص ۱۳۱

[2] حوار الحضارات ص ۱۷۱

کے ذریعہ وجود کی آخری کڑی تک کو شامل ہو یعنی عالمی انسانی تہذیب وہ واحد تہذیب ہو سکتی ہے جو اس کے مسلسل اور روز افزوں ادراک پر حاوی ہو اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ عالمی تہذیب مختلف اور بسا اوقات متصادم تہذیبوں کے ضمن میں متعدد ہو سکتی ہے۔

تہذیب کے تعدّد کا یہ مفہوم اس وجہ سے سامنے آیا کہ تمام تہذیبیں انسان کے زمان و مکان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں اور انسانی ادراک اور اس کی روز افزونی کی تفسیر سے عاجز ہیں لیکن اسلامی تہذیب کا معاملہ مختلف ہے وہ ان مشکلات و مسائل کے تئیں کوئی الجھن محسوس نہیں کرتی ہے بلکہ بہت زیادہ لچکدار ہونے کی وجہ سے ان تمام مشکلات کا احاطہ کرتی ہے کیونکہ یہ اس انسانِ اوّل کی تہذیب ہے جس کے اندر اسی وقت ادراک کی صلاحیت آگئی تھی جب اس کے اندر روح ڈالی گئی تھی، اسے اسماء کی تعلیم دی گئی تھی اور تمیز و انتخاب، ضبط و نظم اور مشاہدہ و تجربہ کی صلاحیتوں کا اس کے اندر الہام کیا گیا تھا گویا یہ تمام انبیاء اور تمام اقوام کے اندر مبعوث پیغمبروں کی تہذیب ہے اور اسلام پر ایمان لانے والوں کی تہذیب ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے ہیں۔ اس وجہ سے یہ وہ انسانی عالمی تہذیب ہے جو حدود نا آشنا ہے اور نسل و قوم کے درمیان کوئی امتیاز اور فضیلت تسلیم نہیں کرتی انسانوں میں ایک ہی وجہ امتیاز جو پسندیدہ ہے وہ ایمان و استقامت کی بنیاد پر قائم ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ

عٰبِدُوْنَ ۔۔ (البقرہ ۔ ۱۳۶-۱۳۸)

(" کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم اسماعیل اسحاق یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے اور ہم اس کی بندگی کرنے والے ہیں ۔")

اس عالمی وحدت کے مقابلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری تہذیبیں، نسل، قومیت، اقتصاد یا دینیات (لاہوت) کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب گورے ہی کو صرف انسان مانا جاتا ہے تو رنگ کا یہ امتیاز کیا غضب ڈھاتا ہے اور کس طرح کالوں اور سرخوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگتا ہے اور جب آریوں اور ان کی نسلوں کی سفید رنگت کو اس بنیاد پر افضل و اعلیٰ قرار دیا جاتا ہے وہی برتر ہیں اور تہذیب کی تشکیل کرنے اور سان سیمون کی تعبیر کے مطابق کو وہ ارتقاء تک اسے لے جانے کی تنہا صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ دوسری نسلیں خواہ وہ گوری ہوں، ارتقاء میں کوئی کردار ادا کرنے سے عاجز ہوتی ہیں الا یہ کہ متعین بلندیوں تک اسے لے جا سکیں، تو اس نظریہ سے کتنے ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہیں ہم ان کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

انسان کے لیے معتدل مناہج (ب)

اس اعتبار سے کہ اسلام ہی عالمی تہذیب ہے، دوسری تہذیبوں سے گفتگو کے میدان میں اپنے مکمل فکر کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور وجود کے تمام ظواہر کی مخالفت کر کے

تاکہ آخر میں اس امر کا اثبات ہو جائے کہ کائنات، انسان اور حیات سے متعلق اس کے تصورات اور مختلف حیاتیاتی طریقوں کے سلسلے میں اس کے خیالات ہی تنہا وہ متوازن تصورات ہیں جو ہر زمان و مکان کے انسان کے لیئے موزوں ہیں اور انہی کے ذریعہ وہ انسانیت کی خوشحالی، امن، عدل، سعادت اور کفایت کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔

اس وجہ سے تہذیب اسلامی کے مفاہیم و تصورات ہی دوسرے مفاہیم کے مقابلہ میں برحق ہیں اور مفاہیم کی بنیادوں اور اصولوں میں ان کے علاوہ جو کچھ ہے سب باطل ہے۔

حکمت کو متاعِ گمشدہ تصور کرنا (ج)

لیکن یہ برحق مفہوم اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہے کہ حکمت جہاں بھی ملے اس کا احاطہ کر لیا جائے اسی طرح علوم و مدنیت کے میدانوں میں اقتباس و انتخاب سے بھی نہیں روکتا۔ چنانچہ اسلامی تہذیب اپنے تصورات اور تمدن کے تہذیبی شکل کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دیتا ہے جس میں اسی طرح ارتقاء آتا جاتا ہے جس طرح ماحول اور موجودات کے ساتھ انسانی تفاعل میں گہرائی آتی جاتی ہے۔ یہ تہذیب ایک طرف اپنے مفاہیم، تصورات اور طریقوں کی حقانیت پر اصرار کرتی ہے اور دوسروں کے اشتراک کو برداشت کرنے کے لیئے تیار نہیں ہے تو دوسری طرف معلومات یا امر واقعہ کی صورت میں ہر علم کے باضمہ اور نمائندگی کو جائز کہتی ہے چنانچہ تمدن اور علم تہذیب کے دو رخ ہیں اور مسلمانوں کی تہذیب کے لیئے ناگزیر ہے کہ ہر تمدن پر برتری ثابت کرنے کے لیئے ان دونوں کا احاطہ کرے۔ اس وجہ سے تمدن، علوم

کے وہ ثمرات ہیں جو انسان کو محیط کائنات کے حسن استعمال سے برآمد ہوئے ہیں اس وجہ سے انھیں تسلیم کرنا اور ان سے دوری اور تردد کا معاملہ نہ کرنا ضروری ہے چنانچہ ان سے وہ تمام عناصر اخذ کئے جائیں گے جو ایجابی اور نفع بخش ہیں اور اسلام کی اقدار، حدود اور اس کے ضوابط سے نہیں ٹکراتے۔

دوسروں کو تہذیب کی تشکیل کا موقع دینا (د)

چونکہ اسلامی تہذیب ہی واحد عالمی تہذیب ہے اس لئے کسی بھی غیر مسلم سے تہذیب کی تشکیل کی صلاحیت ساقط نہیں کرتی۔ اس وجہ سے اسلامی تہذیب اپنی گفتگو میں غیر مسلموں کی تہذیب کا اعتراف کرتی ہے البتہ اس تہذیب کے بارے میں اس کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے بہت سے گوشوں میں انسانی ضروریات اور امنگوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

"اسلام سے پہلے کی رومی، یونانی، فرعونی اور ایرانی شہنشاہیتوں کے مفہوم میں تہذیب کی تصور کی بنیاد ظلم واستبداد اور فرد کی پرستش پر تھی اور غلامی تمام معاشروں کی غالب چھاپ تھی جس پر زندگی کے تمام تصورات قائم تھے .... اور قدیم تہذیبیں ظلم وسنگدلی تعذیب وایذادہی سے لطف اندوزی کے مختلف اسالیب پر قائم تھیں[1]" اور ان تہذیبوں کا مقصد "زمین کے تمام وسائل پر قبضہ کرنا اور دنیا سے جنگ کرنا تھا اور انھوں نے اس راہ میں کسی عمل سے ہاتھ نہ کھینچا اور ہر پالیسی کو مباح کر لیا اور ہر فکر کو جائز قرار دے لیا۔[2]"

یہاں تک کہ جب رومیوں نے بعض قوانین اور لائحہ عمل تیار کئے تو ان کی تنفیذ سرداروں

---

[1] انور جندی، حضارۃ الاسلام

[2] انور جندی، حضارۃ الاسلام

کے حوالے کر دی اور قوم کے غلاموں اور نوکروں سے اس کا کوئی تعلق نہ رکھا جن کے تئیں یہ قانونی پروگرام صرف تعزیرات اور سزاؤں تک محدود تھے اور ان میں اس طرح کی سزائیں بھی تھیں کہ درندوں کے سامنے انھیں ڈال دیا جائے تاکہ قوم کے سرداروں کو لطف مل سکے اور اس خوفناک منظر سے ان کی تفریح ہو یا زبان کھینچ لی جائے یا مجرموں کے منہ میں پگھلایا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔

ہیلین تہذیب کی تاریخ میں آرنلڈ ٹائن بی کہتا ہے کہ "وہ جوہری اسباب جنھوں نے ہیلین تہذیب کو بہت جلد زوال تک پہونچا دیا ان میں ایک اہم سبب شاید وہ تھا جب وہ انسان کی پرستش کی دو اقسام میں سے کسی ایک کو قابل ترجیح قرار دینے لگے تھے۔"

آج کی مغربی تہذیب

رہی آج کی مغربی تہذیب جس نے عالمی قیادت کے علاقوں میں حکمرانی کی اس کی تصویر کشی کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس نے نصف صدی سے کم عرصے میں دو عالمگیر جنگیں بھڑکائیں جنھوں نے پوری انسانیت کو تباہ و برباد کر دیا قطع نظر اس سے کہ اس نے بہت سے ممالک کو اپنا غلام بنایا وہاں اپنی نوآبادیات قائم کیں اور قوموں کے وسائل و ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کو اپنے لئے مباح کیا جبکہ کالوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دی اور سرخوں کا صفایا کر دیا۔ اور اس کے کارناموں کو بیان کرنے کے لیے اس امر کی طرف اشارہ کافی ہے کہ آج تک اجتماعی اور بین الاقوامی سیاسیات میں نسل و رنگ کی بنیاد کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

کارلائل: "مجہول انسان"

~~الکیسس کاریل~~ کارلائل نے اپنی کتاب "انسان نامعلوم" میں لکھا ہے کہ "آج تہذیب جدید

اپنے آپ کو بڑی مشکلوں میں پا رہی ہے کیونکہ وہ ہمارے لئے مناسب نہیں ہے۔ ہمارے حقیقی مزاج سے بغیر کسی آشنائی کے اس کا وجود عمل میں آیا کیونکہ وہ سائنسی ایجادات انسانی شہوات ان کے اوہام و نظریات اور خواہشات کی پیداوار ہے اور باوجود یہ کہ وہ ہماری کوششوں سے وجود میں آئی ہے ہمارے جسم اور ہماری شکل کی نسبت سے غیر مناسب ہے۔"

یہ تجزیہ اس کی کتاب کے مقدمہ میں مذکور ہے جسے انھوں نے ان لوگوں کے لئے رقم کیا ہے جو اس بات کے لئے ہمت پاتے ہیں کہ وہ نہ صرف عقلی سیاسی اور اجتماعی تبدیلی کی ضرورت کا ادراک کریں بلکہ مصنوعی تہذیب کو الٹنے اور انسانی ترقی کے لئے کسی دوسری فکر کے ظہور کی ضرورت کا ادراک کریں۔

گستاؤلیبان کے خیالات

گستاؤلیبان اپنی کتاب " قوموں کے ارتقاء کے لیئے نفسیاتی قوانین" میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایک کھلا زوال یوروپ کی عظیم قوموں کی اکثریت کی زندگی کو دھکی دے رہا ہے۔ خاص طور سے ان قوموں کو جو لاطینی اقوام کے نام سے جانی جاتی ہیں اور جو خون کے اعتبار سے لاطینی نہیں ہیں لیکن روایات اور تربیت میں در حقیقت وہ لاطینی ہیں۔ ان قوموں کی بڑھتی ہوئی مادی ضروریات کی تکمیل ان کی واحد اعلیٰ مثال ہوگی اور انھی میں وہ خاندان کا انتشار دیکھیں گی، اجتماعی ذمہ داریوں کے فقدان پر آہ و بکا کریں گی اور غصہ و ابہام اور تعقید و انتشار محسوس کریں گی آج دور جدید کے آدمی کی مثال اس سفینہ کی ہے جس کا پتوار کھو گیا ہے اور وہ ہوا کے رخ پر ادھر ادھر بھٹک رہا ہو اور اٹکل پچو سے چلنے والی کشتی کی طرح وہ تباہ و برباد ہو جائے۔ آج وہ ایمان کھو چکا ہے اور اس کی وجہ سے بیک وقت امید رخصت ہوگئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد

معاشرہ بہت جلد اثر قبول کرتا اور تیزی سے بدل جاتا ہے اور کوئی اس کے خلاف یہ انگلی اٹھانے والا نہیں ہے کہ بغیر کسی انقطاع کے یہ معاشرہ بدترین لاقانونیت وانتشار اور سخت قسم کے ظلم و استبداد کے درمیان مذبذب اور پریشان ہے۔

لیبیان نظام قیصر کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے کہ[1] "اس کے اندر اس کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے کہ وہ بڑے آرام سے کمتروں میں مساوات اور ان میں اطاعت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔" پھر وہ کہتا ہے "قدیم نسلوں کے نظام ــــ جیسے قیصریت ــــ نے دور حاضر میں ایک واضح تبدیلی کا سامنا کیا ہے آج وہ اشتراکیت کے نام سے بیدار ہو رہا ہے اور مملکت کے استبداد کی یہ نئی تعبیر بلا شبہ قیصری نظام کے اطوار سے زیادہ سخت ہو گی کیونکہ یہ نظام ــــ جو شخصی اور فردی نہیں ہے ــــ خوف کے ان تمام محرکات سے آزاد ہے جو بدترین سرکشوں کو ظلم سے روک سکتی ہیں۔

"......... بلا شبہ اشتراکیت جو عنقریب مٹ جائے گی۔ اس پر علمیت کے رنگ غالب آجائیں گے جو ایسے خیالی معاشرے کے لئے مناسب ہوں گے جسے انسان کبھی وجود میں نہیں لا سکتا اس کے باوجود اشتراکیت ایک جابرانہ نظام ہو گا اس لئے اس کے دوام کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

---

[1] اس نے اپنی کتاب "نفسیاتی قوانین" ۱۸۹۴ء میں اشتراکی انقلاب سے پہلے لکھی۔ اس کا بیان امر واقعہ کے بالکل مطابق ہے وہ اشتراکی نظم کے افلاس کو ضیاع وتسلط کے ذریعہ برسر اقتدار آنے سے نکالتا ہے اس شہادت کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک پیش گوئی تھی آج لیبیان کے مطالعے صحیح ثابت ہو چکے ہیں۔

روجیہ غارودی کے نظریات

اور فرانسیسی مصنف روجیہ غارودی اپنی کتاب "حوار الحضارات" میں یورپی تہذیب کو ڈھلتی چھاؤں کہتا ہے اور یہ فیصلہ دیتا ہے کہ "ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مغربی ثقافت اور اس پر حاوی ہونے والے "فاوستی" طریقہ کے گہرے بحرانوں میں سانس لے رہے ہیں اور یہ "فاوستی" نمونہ ہی ہے جس نے اس مغربی بیداری کے دور کو جنم دیا ہے جو صرف تہذیبی ہی نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری اور سامراجیت کی جنم بھومی بھی ہے۔

سرمایہ داری: یعنی وہ معاشرہ جس نے ایسا مغربی انسان پیدا کیا ہے جو ایک ہی پہلو رکھتا ہے، جو سائنس اور ٹکنالوجی کی آخری ترقی کا منتظر ہے تاکہ غلبہ و منفعت کی اپنی پیاس بجھا سکے۔

سامراجیت: یعنی وہ مغربی معاشرہ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس تکنیکی انسان کو اشیاء کا پیمانہ، تاریخی حقیقت کا واحد مرکز اور قدر و قیمت کا واحد موجد بنا رہا ہے اسی وجہ سے وہ تمام غیر مغربی تہذیبوں کا انکار یا ان کا انہدام کرتا ہے۔ فاوست ہماری مغربی ثقافت کی المیاتی علامت ہے۔"

غارودی کہتا ہے کہ "مغرب کی ترقی دنیا کے ایک بڑے حصے کی پسماندگی سے مضبوط تعلق رکھتی ہے اس کی یہ ترقی لازماً تینوں براعظموں کی دولت کی لوٹ کھسوٹ اور یورپ اور شمالی امریکہ میں اس کی منتقلی کی پیداوار رہی۔ ساتھ ہی مغرب نے اس دنیا کو جسے آج ہم تیسری دنیا کہتے ہیں، پسماندہ بنایا ہے۔

غارودی لکھتا ہے کہ مغربی تہذیب بدترین پھندوں میں پھنستی چلی گئی جن میں سر فہرست قابل لحاظ قوموں پر برتری کا خواب ہے جو کسی طرح کے انسانی حقوق سے متمتع نہیں ہیں۔

اس وجہ سے دنیا کا فرض ہے کہ وہ مغربیت سے پوری طرح الگ ہو جائے۔ اسی

طرح "یونانی عبقریت" اور "رومی معجزہ" کا مسئلہ بھی مغرب کے مسائل میں اس حیثیت سے سرفہرست ہیں کہ وہ دونوں مغربی تہذیب کی دو بنیادیں ہیں اس کی ایک پریشانی یا الجھن یہ بھی ہے کہ یہ قومی برتری کے عذر میں مبتلا ہے اور مغربی تاریخ کو عالمی تاریخ کا محور قرار دیتی ہے اور دوسری تواریخ کو مغربی تاریخ کا حاشیہ کہتی ہے۔

اپنی کتاب حوار الحضارات کے مقدمہ میں روجیہ غارودی اپنی یہ شہادت رقم کرتے ہیں:

"یہ اس کائناتی تجربہ پر شہادت ہے جو کرۂ ارضی پر حاوی ہے۔ اس انسانی معنیٰ میں خوشی کی شہادت ہے جو غیر مغربی تہذیبوں اور ایشیا کے لوگوں نے مجھ تک پہونچائی ہے اور اسلامی علاقوں سے، افریقہ سے اور لاطینی امریکہ سے مجھ تک آئی ہے یہ وہ شہادت ہے جو اس چیز پر مشتمل ہے جس کی میں نے تحقیق کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تمام تہذیبوں میں ان تمام انسانوں کے نزدیک الٰہی نقش کی حامل شہادت کا انکشاف کیا ہے۔"

اس کی شہادت کا مضمون درج ذیل ہے: "مغرب ہنگامی ہے عارضی ہے ہر اس ایجاد کے سلسلے میں جو مستقبل کو محیط ہو یہ پہلا مطالعہ ہے اور یہ طرز اور طریقہ جسے مغرب نے یہ سمجھ کر ترتیب دیا تھا کہ فرد تمام اشیاء کا مرکز، اور ان کا پیمانہ ہے اور واقعات کو مفہوم و محسوس شکل میں ڈھالا جائے یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعہ ترقی ہو کیونکہ یہ مروجہ اشیاء اور عوام کو بلند اقدار کی صفوں تک پہنچانے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اس انسانی جنگ میں معمولی استثناء کا طریقہ ہے جو تین ملین سالوں تک چلتی رہی۔

میں "سفید برائی" کا اطلاق اس بدبخت اور منحوس دور پر کرتا ہوں جس میں تاریخ کا یہ گورا انسان ابھرا اور نمایاں ہوا تھا۔ اور اگر گورے انسان کے امتیاز کی قائل سابق نسل حکومت ~~سے ہم الگ ہو جائیں تو ہم~~ دیکھیں گے کہ مغرب کے چشمے (یونانیت، رومیت، مسیحیت،

ایشیا اور افریقہ میں ظاہر ہوئے ہیں۔

بیداری کا دور صرف تہذیبی تحریک تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ وہ دور تھا جس نے سرمایہ داری اور سامراجیت کو جنم دیا اور مغرب کی تہذیبوں سے برتر دوسری تہذیبوں کو منہدم کردیا جن میں "خواہش انسانی" کی چوٹی ہونے کے بجائے انسان کے تعلقات فطرت، معاشرہ اور ناموس الٰہی سے تھے۔

حقیقی تاریخ یعنی وہ تاریخ جو مغرب کے گرد مرکوز ہونے سے نفرت کرتی ہے، ان "اوقات" کی تاریخ ہو سکتی ہے جنھیں انسانیت نے اس مغربی تفوق کی وجہ سے ضائع کر دیا جس کا مرجع ثقافت کا تفوق نہ تھا بلکہ فوجی و ظالمانہ مقاصد کے لیئے ہتھیار اور سمندر کی ٹکنالوجی کے استعمال کا مرجع تھا۔

غارودی مغربی تہذیب کے مسائل اور الجھنوں کو ٹھکرانے کے بعد اس بات پر زور دیتا ہے کہ آج دنیا کو ایک ایسے نئے کائناتی تجربہ کی ضرورت ہے جو مختلف تہذیبوں کے درمیان مباحثہ پر قائم ہو اور مغربی تہذیب اس تجربہ کو پیش کرنے سے عاجز ہے چنانچہ وہ مختلف تہذیبوں کے درمیان گفتگو کی دعوت دیتا ہے اور "اس گفتگو کے ذریعہ ممکن ہے کہ ایک کائناتی قانون جنم لے سکے جو مستقبل کے ایجاد کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے مستقبل کا اختراع کریں۔"

کانسٹانٹیان جارج کا خیال

ایسا لگتا ہے کہ غارودی ان دیکھے طریقے سے روسی مصنف کا کانستانتان جارج کی کتاب "پچیسویں ساعت" سے متفق ہے۔ یعنی وہ ساعت جو مغربی تہذیب کی طویل اور

تاریک رات کے بعد ایک نئی تہذیب کا مشاہدہ کرے گی۔ جارج نے اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ مغربی تہذیب یورپ، امریکہ اور روس کی تہذیب ہے۔ یہ افلاس کا شکار ہے اور مکمل انحطاط کے راستے میں ہے وہ ایک ایسی امت سے توقع لگائے ہوئے ہے جو با اصول ہو انسانی حالات کو سمجھتی ہو اور انسانیت کی نجات دہندہ بن کر سامنے آئے۔ وہ کہتا ہے "اس مشینی انحطاط کے بعد انسانی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے گا اور عنقریب یہ عظیم روشنی مشرق سے طلوع ہو گی بلا شبہ ایشیا میں اس کا افق ہو گا لیکن روس نہیں۔ روس مغرب کی بجلی کی روشنی کے سامنے شکست کھا چکے ہیں وہ اس ضیاباری کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکے گے۔ عنقریب مرد مشرق مشینی معاشرہ کو اڑا لے جائے گا اور سڑکوں اور گھروں کو منور کرنے کے لیے وہ بجلی کی روشنی کا استعمال کرے گا لیکن غلام کا مرتبہ اسے نہ پہونچ سکے گا نہ عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو ختم کیا جائے گا جیسا کہ آج مغربی مشینی معاشرہ کی بربریت میں موجود ہے وہ نیون (Neon) گیس سے روشنی حاصل نہیں کرے گا نہ اس سے قلب و دماغ کو روشنی کرے گا بلکہ یہ مرد مشرق اپنے آپ کو آلات اور مشینی معاشرہ کا سردار ثابت کرے گا۔"

مصنوعی تہذیبیں

اسی وجہ سے اور دوسرے اسباب کی وجہ سے اسلامی تہذیب دوسروں کی تہذیب کو مصنوعی کہتی ہے جن کی تفصیل ایسی صورت میں پیش کی گئی ہے جو انسان کے جسم، اس کی شکل اور اس کی روح سے مناسبت نہیں رکھتی جیسا کہ کارلائل کا کہنا ہے۔ البتہ یہ وہ تہذیبیں ہیں جن سے روجیہ غارودی کی تعبیر کے مطابق گفتگو ممکن ہے لیکن یہ گفتگو انسانیت

اور دنیا کی تلاش اور تحقیق و عطا کی اس کی صلاحیت کے اثبات کے ذریعہ تہذیب اسلامی کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیئے ہوگی یہی وہ تہذیب ہے جو کارلائل کے قول کے مطابق راست طریقہ یا ترقی و پیش رفت سے زیادہ قریبی فکر کی مالک ہے اور اس نے واحد کامل انسانی تہذیب کو تسلیم کیا ہے اور انسانی زندگی کی پسماندگی اور نقص کے تمام اسباب و عوامل کا اور تمام الجھنوں کا انکار کیا ہے۔

عطاء اور وجود ضوابط کا رشتہ

البتہ اسلامی تہذیب جو واحد اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ جارج کی ان امنگوں کو پوری کر سکے کہ انسان مشین کا آقا ہو اس کا غلام نہ ہو اور نیون سے دل و دماغ کو نہیں بلکہ گھروں اور سڑکوں کو روشن کرے۔ یہ تہذیب جیسا کہ ہم نے دیکھا اپنے مخصوص نکات و مقاصد پر اصرار کرتی ہے اور مکمل عطاء کے مرحلہ میں اس وقت داخل ہو سکتی ہے جبکہ اس کے ضوابط وافر مقدار میں موجود ہوں۔ اس صورت میں اسلامی تہذیب اپنی عطاء و بخشش میں متردد نہ ہوگی۔ عطا اس کی وہ قدر ہے، جس سے وہ کبھی الگ نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ توقف کے مرحلہ میں بھی عطاء و بخشش کا سلسلہ نہیں روکتی پھر اس وقت اس کے فیضان کا کیا عالم ہوگا جب از سر نو وہ عطاء کے مرحلہ میں داخل ہوگی

اسلامی تہذیب اپنے نمو وارتقاء اور اپنے تمام تصورات کی ہر سطح پر پابندی کے درمیان ربط پر بہت زور دیتی ہے گرچہ علوم کی ایجاد اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ دوسری قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا بھی اس کے لئے ممکن ہے۔

میں مسلمان ہوں اس لیے مہذب ہوں

اسلامی تہذیب تمام تصورات و اعتبارات کو زندگی کے تمام میدانوں میں وسیع اثرات

الحاد کی حامل للکار سنائی دیتی ہے وہ یہ کہ مسلمان کے لیئے یہ ناممکن ہے کہ وہ مہذب نہ ہو۔۔۔ اللہ کے طریقہ اور اسلام کے خاص وعام تصورات کی پابندی کرنے والا مسلمان تہذیب اسلامی کے وجود و تسلسل پر دلیل ہے خواہ وہ عطا سے توقف کے مرحلہ میں ہو یعنی مسلمان کسی حال میں بھی پسماندہ نہیں ہوتا، اس کی اسلامیت اسے تہذیب، تفاعل، کائنات کے استعمال اور آزاد و پاکیزہ زندگی کے قیام جس میں امن ہو راحت ہو اطمینان ہو اور عدالت اور خوشحالی ہو ـــــ جو تمام تہذیبوں کے پیمانے ہیں ـــــ پر آمادہ کرتی ہے اس وجہ سے بغیر کسی زحمت کے ہم یہ اصول متعین کر سکتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں اس لیے مہذب ہوں"۔

اس اصول کے بہت سے شعوری پس منظر ہیں یہ ایک حیثیت سے ہر مسلمان میں ایمانی بلندی کی فکر پیدا کرتی ہے لیکن مقصد دوسری قوموں کو ذلیل و رسوا کرنا نہیں ہوتا بلکہ انہیں نجات یاب بنانا ہوتا ہے چنانچہ جب مسلمان اس بات کا ادراک کرتا ہے کہ وہ مرد تہذیب ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ انسانیت پر گواہ ہے تو اسلامی تہذیب اس ذاتیت کو وجود میں لا رہی ہوتی ہے جس میں تہذیب کا نیا معیار جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس طرح مسلمان تہذیب کے بڑھتے رفتار کا امین ہوتا ہے، اس جدید تہذیب کی اقامت کا کفیل ہوتا ہے جو انسانوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت میں داخل کرے گی اور ادیان و مذاہب اور عقائد کے ظلم سے نکال کر اسلام کی عدالت میں داخل کرے گی اور مشین کی پرستش سے نکال کر روح کی حکومت میں پہونچانے گی اور انسانی صلاحیتوں اور اقدار کے ابطال سے انہیں نکال کر ان کے اعتراف اور ارتقاء کے مرحلہ میں داخل کرے گی۔

فصل ۵

اسلامی تہذیب میں ہراول دستے کا کردار

فصل ۵

تہذیب اسلامی کو عطاء کے مرحلہ میں داخل کرنے کے لیے ہراول دستے کا کردار

کوششیں، اصول، راستہ اور ہدف کے بین بین

طلبہ اور نوجوان

بنیادی تہذیبی شعور

تہذیبی ظواہر مقابلہ کی لکیر کی قیادت کرتے ہیں

ازالہ و ترمیم اور قیادت کا بانجھ پن

حرکی عقلیت کا مزاج

معیار مطلوب تک اوپر اٹھنا ضروری ہے

تہذیبی للکاروں کے فریم کی تحریک ناگزیر ہے

نوجوانوں کی ذمہ داری

اسلامی تہذیب میں ہراول دستہ کا کردار

"میں مسلمان ہوں اس لئے مہذب ہوں" کا یہ اصول اسی قدر صحیح ہوگا جس قدر مسلمان تہذیب سے متعلق اسلام کے تصورات اور تفاعل کو زندہ رکھے گا۔ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی تہذیب شخصی فردی نہیں ہے اس کا اظہار صرف مسلم معاشرہ میں ہوتا ہے۔ جب وہ کسی متعین زمانے میں کسی متعین سرزمین پر اپنی اجتماعیت کو قائم کرتے اور اپنے اوپر اور اپنے معاشرے پر ان مفاہیم تصورات کو نافذ کرتے ہیں اور فضا اور موجودات کے ساتھ تہذیبی تفاعل (cultural Interaction) کی تحصیل کرتے ہیں۔

اس وجہ سے "مسلمان ہونے کا مطلب مہذب ہونا ہے" کا یہ اصول جس قدر تہذیبوں کی اختیار کے لیئے للکار اور ان کے ساتھ مباحث کا چیلنج ہے اسی قدر مسلمانوں کو ذاتی چیلنج بھی ہے کیونکہ ان کی تہذیب کے لئے ان کی اجتماعیت ناگزیر ہے اور ان کے اس معاشرے میں تہذیبی ضوابط کی مکمل موجودگی ضروری ہے تاکہ ان کی تہذیب عطا پر قادر ہو سکے اور ایک اسلامی معاشرہ قائم کر سکے چاہے سید قطب کی تعبیر کے مطابق وہ ایک معمولی بستی ہی ہو لیکن وہ پوری کائنات میں عظیم انقلاب برپا کرے گی اور انسان کسی پڑھے جانے والے یا سنے جانے والے نظام سے اس وقت متاثر نہیں ہو سکتے جس قدر وہ کسی ایسے زندہ و متحرک اور مجسم نظریہ پر لبیک کہیں گے جو انسانوں کی ایک جماعت کی زندگی میں ڈھلا ہوا اور محسوس و مشاہد واقعہ کا روپ اختیار کر چکا ہو جسے آنکھیں دیکھ سکیں، ہاتھ انھیں چھو سکیں اور ذہن و دماغ ان کے اثرات قبول کر سکیں۔ کیونکہ مسلم معاشرہ کا قیام درحقیقت یہ معنی رکھتا ہے کہ

مسلمانوں کے ایک مجموعہ میں ہراول دستہ کا عمل پختگی کے مرحلے میں پہونچ چکا ہے اور زندگی کے اہم ضوابط کا مالک ہے اس سے وہ اسلامی تہذیب کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے زیادہ لائق ہو سکے گا اور اسلامی تہذیب توقف کی زنجیروں سے نکل کر عطا و بخشش کے روشن اور تابناک دور میں داخل ہوگی۔

کوششیں ـــ اصول، راستہ اور ہدف کے بین بین

بلاشبہ یہ کوششیں خطرات و مصائب سے پر ہیں اس لئے یہ مزید منصوبہ بندی، ردیہ پر نظر ثانی، ارشاد و تنفیذ کی مہارت کی محتاج ہیں اور ناگزیر ہے کہ قیادت و انتخاب کے مرحلہ سے اوپر اٹھ کر ہراول دستہ کی ذمہ داری کی سطح تک پہونچا جائے۔

کوئی بھی کوشش ہو اس کے لیئے کچھ اصول ہوتے ہیں جنھیں اختیار کرنا ضروری ہے۔ ایک راستہ ہوتا ہے جس پر چل کر منزل مقصود تک پہونچنا ہوتا ہے، ہر وہ کوشش جو ان بنیادی عناصر ـــ اصول، راستہ اور مقصود ـــ سے یا ان میں سے بعض سے محروم ہو اس کا نتیجہ عام طور پر ناکامی و نامرادی ہوگی اور کوشش جتنی واضح اور اپنی بنیادوں میں گہری ہوگی اتنی ہی طاقت کے ساتھ زندہ و متحرک واقعہ کی صورت میں جلوہ گر ہو سکے گی۔

طلب اور نوجوان

کوشش کی یہ طلب ہمیشہ نوجوانوں پر فرض ہوتی ہے اس منتخب ہراول گروپ کا یہ کام ہوتا ہے جو صحت مند باشعور قیادت کے منصب پر فائز ہوتا ہے یا توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ اسے یہ ذمہ داری ملے گی۔ بڑی حد تک اس قیادت کے تفاعل کا درجہ کامیابی

اور غلبہ کے راستہ کی ترسیم کرتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی کہتا ہے کہ "ہر انسانی جماعت میں اس قائدانہ منتخب گروپ کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ ترقی کر سکے اور اس کے حالات بہتر ہو سکیں، اگر جماعت اس گروپ سے محروم ہو تو ترقی مکمل نہیں ہو سکتی گویا یہ گروپ ترقی و بیداری کا خمیر ہے۔" مزید کہتا ہے "تمام جماعتوں کا انجام ہمیشہ اسی منتخب گروپ اور اس کے حالات سے مربوط ہوتا ہے اگر اکتشاف، تحقیق، تجدید اور ذمہ داریوں کے احساس کے بجائے اس گروپ میں اضطراب، پریشانی اور بیماری ہو تو ان کے ارد گرد وہ انسانی جماعت تشکیل پاتی ہے جو اپنا راستہ بڑی سستی اور بے دلی سے طے کرتی ہے اور ان کے بعد آنے والی نسل اس راستے کو طے کرتی ہے۔"

اس وجہ سے تہذیب کی تلاش و جستجو میں نوجوانوں کا رول بہت اہم ہے۔ یہی لوگ امت کا خمیر ہوتے ہیں اور امیدوں اور تمناؤں کا مرکز ہوتے ہیں۔ اسلامی تہذیب میں اونچا مقام انہی کو ملتا ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو اپنے رب پر ایمان لائے اور اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ یہ ان سات افراد میں سے ہیں جنھیں اللہ اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا اور یہ لوگ سب سے پہلے وہ گروہ ہیں جو اثر انداز ہوتا اور قیادت کرتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ امت کے نگہبان ہیں اور تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔

وہ سوال جو تہذیب اسلامی کے توقف کی صورت کے سامنے آتا ہے کئی سوالوں میں بٹ جاتا ہے: آج نوجوانوں کی ذمہ داری کیا ہے؟ ان کا رول کیا ہونا چاہیئے؟ اور تہذیب کے توقف کے مرحلے میں وہ کس طرح کام کریں؟ اور تہذیب اسلامی کو مکمل عطا کے مرحلے میں پہونچانے پر وہ کس طرح قادر ہو سکیں گے۔

ان سوالات کے جوابات نہ مخفی ہیں نہ معمہ ہیں یہ ان اعمال کا مجموعہ ہیں جن سے

مطلوب ومقصود کی راہ میں کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔

تہذیبی توقف کے اسباب جنھوں نے عام صورت اختیار کرلی ہیں معروف ومشہور اور قابل ادراک ہیں انھی سے نقوشِ راہ کی ترسیم ہو سکے گی۔

بنیادی تہذیبی شعور

اسلام کے عام تصورات اور اس کے بنیادی مفاہیم کا اصل تہذیبی شعور ناگزیر ہے یعنی لوگوں کی نگاہوں سے تمام پردے ہٹا دینے چاہیں تاکہ وہ زیادہ سچائی کے ساتھ اسلام کو اس کے مختلف پہلوؤں میں دیکھ سکیں۔

اس شعور کو حاصل کرنے کے لیے کچھ چیزوں سے تجاوز، کچھ چیزوں کا مقابلہ اور کچھ چیزوں کی ترسیخ ناگزیر ہے تجاوز اپنی ذاتیات سے ہوگا، مقابلہ دشمنوں سے ہوگا اور ترسیخ اپنے افکار وتصورات اور اصولوں کی ہوگی۔

اس مقابلہ، تجاوز اور ترسیخ کی لکیر ایک دائمی نت نئی اور متغیر تحریک ہے جس کی قیادت وہی ہراول گروپ کرسکتا ہے جسے اپنے وجود کا شعور ہو عزائم کا ادراک ہو اور اپنے ارادوں پر مکمل یقین ہو۔

اس ہراول گروپ کی صورت سے مراد وہ تمام تہذیبی امتیازات ہیں جنھیں اسلامی تہذیب نے مہیا کیا ہے اور حالتِ توقف میں بھی انھیں مہیا کررہی ہے۔ جن امتیازات کی تعیین ہم ابھی ایک طرف علماء، مفکرین، قائدین، تحریکات، تنظیموں اور اسلامی یونیورسٹیوں سے کرچکے ہیں اور دوسری طرف ثابت اداروں جیسے مساجد، اداروں، حج، زکوٰۃ وغیرہ سے بھی ان کی تحدید ہوچکی ہے۔

تہذیبی ظواہر مقابلہ کی لکیر کی قیادت کرتے ہیں

یہ تہذیبی ظواہر جو توقف کے مرحلے میں تہذیب اسلامی کی دین ہیں، یہی اس مقابلہ کی لکیر کی قیادت کرتے ہیں جس کے ارد گرد تمام طاقتیں اور صلاحیتیں اس لئے مرکوز ہیں تاکہ اسلامی تہذیب

کی حفاظت ہو اور ضوابط کے قیام سے اور اس روئے زمین پر یا اس کے کسی گوشے پر از سر نو استلاف کے عمل سے تہذیب عطا و بخشش کے مرحلہ میں داخل ہو سکے۔

یہاں عام طور سے نوجوانوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ تہذیبی ظواہر کی تحریک ہو سکے انھیں غلطیوں سے بچایا جا سکے، مقصد کی طرف ان کی پیش رفت میں ارتقا ہو اور اعلیٰ غایات کی تحصیل میں ان کی رفتار تیز تر ہو سکے۔

جب تہذیبی ظواہر ہی مقابلہ، تجاوز اور ترسیخ کی لکیر کی قیادت کرتے ہیں تو نوجوانوں کا فرض ہے ـــــ جبکہ وہی ان ظواہر کے بنیادی ستون ہیں ـــــ کہ ان کی حفاظت، ارتقا اور فیضان کے لیے اپنے کردار ادا کریں۔

ازالہ و ترمیم اور قیادت کا بانجھ پن

ان نوجوانوں کے عملی انقلاب میں سب سے بڑا چیلنج ازالہ و ترمیم کی کارروائیوں میں پوشیدہ ہے۔ مذکورہ ظواہر کے تئیں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ بعض ظواہر اپنے زمانے میں نہیں جیتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور زمانے میں سانس لے رہے ہیں گویا زمانہ ان سے آگے بڑھ چکا ہے اور اسلامی تہذیب ان جدید افرازات کے بارے میں جواب دہ رہ گئی ہے جو اہم رول ادا کرنے پر قادر ہوں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض ظواہر ـــــ جیسے بعض تحریکات و تنظیمات ـــــ ضعف کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کے قائدین کو ان میں سے بعض کو لاحق ہو جاتا ہے اور یہ لوگ ہر اوّل گروپ کا کردار ادا کرنے سے یا مقابلہ و ترسیخ کی لائن میں خلیج پاٹنے سے عاجز رہ جاتے ہیں خود اپنے آپ میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں اور اپنی تحریکوں پر ترمیم و تغیر کے دروازے یہ کہہ کر بند کر لیتے ہیں کہ انہی کی راہ نے صحیح ہے اور اس تحریک کے افراد کی ذمہ داری یہی ہے کہ اپنے ہی چشموں سے

دیکھیں یہاں ہوتی کہ تحریک کو ـــــ جبکہ یہ اول گروپ مردہ ہو چکا ہے ـــــ دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑتا ہے یا تو وہ ضعیف قیادت کی رائے کے سامنے سپر ڈال دے اور ان کے ساتھ سمٹ کر رہ جائے یا تحریک اٹھ کر کھڑی ہو جائے اور جامد قیادت کو راستے سے ہٹا دے اور خود مقابلہ و تغیر کی لائن میں چل پڑے یا پھر ایک ہی تحریک کے اہل تغیر اور جمود پسند افراد آپس میں ٹکرا جائیں، آپس میں اختلاف ہو جائے اور تحریک کئی دھڑوں میں منقسم ہو جائے۔

شاید یہ ذاتی تفاعل تحریکوں کا فطری کام ہے لیکن تہذیبی ظواہر کے ساتھ یہ مقصد کے لیے بہت اہم ہو جاتا ہے چنانچہ تمام اسلامی تحریکات یا تمام تہذیبی مظاہر کی اسلامیت کے عنوان سے موجودگی کافی نہیں ہے نہ یہ کافی ہے کہ ان کے قائدین یا ہراول گروپ اسلام پر ایمان کا، اسلامی اصولوں کی معرفت کا اور اسلامی تصورات و مفاہیم کے ادراک کا اعلان کرتا رہے بلکہ عمل اور تفاعل بھی ناگزیر ہے عمل ان تصورات پر ممکن حد تک ہو اور انھیں محیط واقعات کے ساتھ تفاعل، وسیع معلومات، دشمن کی سرزمین کا عمیق مطالعہ بھی ضروری ہے اور زمانے کے اسالیب، اور اس کے طریقوں سے واقفیت اور اس تہذیبی مظہر کی خدمت میں جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ممکن حد تک ان سے استفادہ بھی ضروری ہے۔

حرکی عقلیت کا مزاج

لیکن بعض حرکی تہذیبی ظواہر کے ڈھانچوں کا مطالعہ کرنے وقت اور انقلاب کو وجود میں لانے کی عدم قدرت کے اسباب کا تجزیہ کرتے وقت ہم اس بات کو پیش نظر رکھنے ہیں کہ قیادتوں کی "عقلیتوں" کا مزاج بھی انقلابی کاموں کے سست پڑنے کا ایک جزو ہے۔ یہاں قیادت کی نااہلی کو صرف ایک جزو قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے اجزاء ایسے حالات

ظروف سے متعلق ہیں جن کے بارے میں ظواہر کے قائدین اصلاً ذمہ دار نہیں ہیں۔

یہاں ہم ـــــ اور عام صورت میں بھی ـــــ یہ کہتے ہیں کہ اسلام پسند مفکرین اور تحریکات پر واجب ہے کہ وہ کھلے دماغ کے ساتھ کام کریں۔ ایک حلقہ میں سمٹنے سے انکار کریں اور تحریک کے معاملات اور تغییر کے وسائل سے اس مشہور اصول کی روشنی میں تعلق رکھیں کہ "اللہ اس آدمی کا بھلا جس نے اپنے زمانے کو پہچانا اور اس کا طریقہ راست رہا"! اس لئے کہ نوجوانوں، تحریکات اور اداروں کو سب سے خطرناک مرض جو لاحق ہوتا ہے وہ ذمہ دارانہ حس کی بلادت ہے جسے ہم قیادت کے بانجھ پن سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ وہ اہم ظاہرہ ہے جو تحریک اور اس کے تفاعل کا صفایا کر دیتا ہے اور اسے ـــــ مطابقِ معمول کاموں (Routine work) میں تبدیل کر دیتا ہے جس میں نہ کوئی جدت رہتی ہے نہ زندگی باقی رہتی ہے اور تہذیبی ظاہرہ کو افلاس کے اس مرحلہ سے بہت قریب کر دیتا ہے جو ہلاکت و تباہی تک پہونچا دیتا ہے۔ اس طرح کے بانجھ پن کی موجودگی میں تحریک کے لئے مشکل ہے کہ مطلوبہ تبدیلی پیدا کر سکے یا یہ دیکھنے کے لئے زندہ رہ سکے کہ اسلامی تہذیب توقف کے اس مرحلہ سے چھٹکارا پا سکے جسے اس نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے اور یہ وہ آزادی ہے جو اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک سر اول گروپ اپنے مفید اور بار آور امتیازات میں مطلوبہ معیار تک نہ بلند ہو جائے۔

• معیار مطلوب تک اوپر اٹھنا ضروری ہے

ایک ہی چیز ـــــ جیسا کہ سید قطب نے لکھا ہے ـــــ ہمارے سامنے رہنی چاہیئے وہ یہ کہ ہمارے سامنے ایک طویل مشقت طلب، سخت اور تلخ جنگ ہے۔

جس کے لیئے ہمیں پوری طرح تیار رہنا ہے۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم اس کشمکش کے لیئے ایسی تیاری کریں کہ ہم اس دین کی سطح تک اوپر اٹھ سکیں، ہم اپنے ایمان اور عبادتِ خداوندی کی حقیقت میں اس کے معیار کو پہونچ سکیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول کا شعور رکھنے اور اپنے زمانے کے اسالیب سے واقف ہونے میں ہم اس کی سطح تک پہونچ سکیں اور اللہ اس آدمی کا بھلا کرے جس نے اپنا زمانہ پہچان لیا اور اس کا راستہ سیدھا رہا۔ اپنے زمانے کی ثقافت، اس کی تہذیب اور اس ثقافت کے عمل کا احاطہ کرنے میں ہم اس دین کے معیار کو ملحوظ رکھ سکیں "یہ تہذیب انتخاب اور تجربہ کا عمل ہے ہم حکومت پر اس طرح کی قدرت کہ جو چاہیں اس سے اخذ کریں اور جو چاہیں چھوڑ دیں، اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب معرفت اور تجربہ کے ذریعہ اس پر قبضہ کریں۔ معرفت اور تجربہ ہی سے ہم اختیار کا اقتدار حاصل کریں گے۔"[1]

اس وجہ سے نئی نئی قیادتوں کا جگہ لینا ناگزیر ہے اور ان ہراول دستوں کی ٹریننگ اور ان کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کرنا ضروری ہیں جو انھیں مقابلہ و تغییر کی لائن میں اپنا رول انجام دینے کے لائق بنا سکیں۔

اہم ترین ضرورت اور ناگزیر لازمہ نوجوانوں کے درمیان قائدانہ صلاحیتوں کو ارتقاء دینا ہے تاکہ یہ لوگ اس سخت کشمکش کا مقابلہ کر سکیں اور اسلامی تہذیب کے تمام مظاہر کو ان کے منتہائے مقصود تک پہونچا سکیں۔

تہذیبی للکاروں کے فریم کی تحریک نہیں ہو سکتی

نوجوان قائد کے کندھوں پر جو اہم ذمہ داریاں آپڑی ہیں ان میں ایک ذمہ داری ان للکاروں

---

[1] المستقبل لہذا الدین ص: ۹۱

کے ذہیم کو حرکت دینا ہے جو تہذیب اسلامی کی طرف سے بار بار سامنے آتے ہیں جن للکاروں کو ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں ان میں اسی وقت حرکت پیدا ہو سکتی ہے جب ایسی زبردست اور سخت کوشش کی جائے جو ان للکاروں کے مناسب حال ہو ورنہ یہ چیلنج اور للکار خالی خولی دھمکیوں اور ناقابل اعتبار بتوں میں تبدیل ہو جائیں گی اور نتیجہ کے طور پر منتظر تہذیبی تبدیلیوں میں اپنے اثرات و نفوذ کھو دیں گی خواہ وہ تہذیب اسلامی کا علاقہ ہو یا دوسری تہذیبوں کا، ہر جگہ متوقع تبدیلیوں میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

اس تحریک کا نقطۂ آغاز یہ ہوگا کہ اس افسوسناک حالت کو ختم کیا جائے جسے تہذیبی پسماندگی یا دوسروں کی تہذیبوں سے مرعوبیت یا تہذیبی یلغار کے سامنے احساس کوتاہی و بزدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ وہ حالت ہے جو امت مسلمہ پر پوری طرح طاری ہے۔

اس صورت حال کے مکمل خاتمہ اور انسانی ذہنوں سے اس کے استیصال کے لیے نوجوانوں کو منصوبہ بندی اور صبر و استقامت کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں غرناطہ کے میڈیکل کالج میں نفسیات کے استاذ ڈاکٹر دون بویس روفاس کی فریاد بھی سن لیں۔ وہ کہتے ہیں "تہذیب مغرب کے متوالوں سے کہو کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں۔ اے عرب، اے مسلمانو! اپنے تصورات کو یوروپین تصورات سے خلط ملط نہ کرو، تم ایک مضبوط و مستحکم تہذیب کے مالک ہو۔ یہ تہذیب مادی لحاظ سے گرچہ مغرب کے معیار کو نہ پہونچ سکی تاہم یہ تہذیب اپنے بنیادی اجزا پر مشتمل ہے جن سے ہمارے یوروپین ممالک کی تہذیب محروم ہے۔ انسان نے سائنس کے واسطے سے اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بٹھانا چاہا ہے لیکن اس نے اپنے خیالات سے اس سائنس کو کہیں فرو تر اور کمتر پایا۔ لوگو! یہی تراشیدہ خوشنات کی وجہ سے اپنے اسلامی تصورات سے دست بردار نہ ہو جاؤ اور مغربی تہذیب کو تعظیم و تکریم کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ وہ عنقریب منہدم

ہو جائے گی۔"[1]

ان شروعات سے "میں مسلمان ہوں اس لئے مہذب ہوں" کا اصول اور اس کے تابع اسلامی مفاہیم و تصورات کی توضیح اور ان کے عمل کی ضرورت و ناگزیریت سب تم آہنگ ہے اور ان سب کا تعلق تہذیبی تفاعل سے ہے اس لئے برتری اور تفوق کے بانی جذبات کے بغیر تفاعل کی صلاحیتوں میں خاص طور سے سفر کے اولین مراحل میں جدت نہیں پیدا ہو سکتی۔ نہ فیضانات، عطیات، صلاحیتوں اور طاقتوں کا افراز اس کے بغیر ممکن ہے۔ بیرشبہ "میں مسلمان ہوں اس لئے مہذب ہوں" کا اصول ان اعلیٰ صلاحیتوں اور متفوقانہ وسائل کا منکشف ہے۔

اس طرح یہ تہذیبی للکار ایک مکمل سلسلہ میں منسلک ہیں تاکہ ان کی معیت میں نوجوانوں کو یہ ادراک ہو جائے کہ وہ ایک متوقع تہذیبی تغیر کے سامنے کھڑے ہیں اور ان کی ذمہ داری ہے کہ ہر بوجھ کو اٹھائیں، ہر تنظیم کی صلاحیت پیدا کریں اور امت کے جسد ناتواں میں ہر ممکن طریقے سے روح پھونکیں اور اس کے اداروں میں حرکت پیدا کریں تاکہ ایک زندہ و متحرک وجود ابھر کر سامنے آئے جس میں اسلامی تہذیب کے تمام چیلنج اور مقابلے پرورش پا سکیں۔

نوجوانوں کی ذمہ داری

یہیں سے مسلمان نوجوان کی ذمہ داری ابھر کر سامنے آتی ہے جو باشعور ہو اور اپنے ملک کے سرکاری و قومی اداروں میں اسلامی مفہوم کے مطابق قیادت کرے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے اداروں اور اپنے معاشرے کو اسلامی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق بنائے تبھی یہ مباحث

---

[1] مستقبل الحضارة الاسلامية انور الجندی

ان چیلنجوں میں تبدیل ہو سکیں گے جو ہر سطح پر اہم تفاعل کا اظہار کریں گے۔ اس وجہ سے نوجوانوں کا رول متوقع ہو جاتا ہے کیونکہ معاشرہ کا یہی وہ حصہ ہے جو اجتماعی، اقتصادی، مالی، عمرانیاتی، تربیتی، سیاسی، طبی، اعلامی، قانونی، عدالتی اور منصوبہ بندی سے متعلق مسائل و منافع کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور مربوط کر سکے گا۔ چنانچہ یہ چیزیں تہذیبی للکاروں کے ارادہ کے ضمن میں آجائیں گی تاکہ تہذیبی ظواہر کے خروج میں اضافہ ہو اور زندگی، ارتقا، صلاحیت، مقابلہ اور سختی میں ان کو مزید قدرت حاصل ہو اور بلاشبہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے تو حسن تنفیذ ضروری ہے لغزشوں پر قدرت حاصل کرلی ہے، حالات سے استفادہ کرنا ہے اور نوجوانوں کی اس طاقت میں باصلاحیت فیضانات میں تسلسل ناگزیر ہے۔ ان ذمہ داریوں میں تنظیم، تعارف، قوت کشش اور قوت اتحاد واجب ہے کیونکہ اسلامی منطق میں ـــ اسی طرح اس زمانے کے اسالیب میں بھی ـــ انفرادیت اور انتشار جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے بربادی لازم آتی ہے جبکہ بدترین حالات میں بھی ان تہذیبی ظواہر کا حجم کئی گنا زیادہ ہوتا ہے جنھیں اسلامی تہذیب فیاضی سے خارج کرتی ہے۔

• ــــــــــــــــــــ •

اہم مراجع

۱۔ ماوراء التاریخ، — ولیم ہاولز

۲۔ الحضارة تحت التجربہ، — آرنلڈ ٹائن بی

۳۔ الحقیقۃ الحضاریہ، — ڈاکٹر جارج حنا

۴۔ مقدمہ ابن خلدون، — ابن خلدون

۵۔ شروط النہضۃ، — مالک بن نبی

۶۔ معالم فی الطریق، — سید قطب

۷۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، — سید ابوالاعلیٰ مودودی

۸۔ نظام الاسلام، — تقی الدین النبہانی

۹۔ الحضارة، — حسین مؤنس

۱۰۔ قصۃ الحضارة، — ول ڈیورانٹ

۱۱۔ الغرب والشرق الأوسط، — برنارڈ لویس

۱۲۔ حضارة الاسلام، — انور الجندی

۱۳۔ حوار الحضارات، — روجیہ غارودی

۱۴۔ نفسیۃ الأمم، — گستاؤ لیبان

۱۵۔ المستقبل لھذا الدین — سید قطب